زرد رُتوں کا آخری پھُول

نبیلہ ابر راجہ

زرد رُتوں کا آخری پھول

اسپورٹس چینل سے خواتین کی ریسلنگ دکھائی جا رہی تھی۔ اسریٰ کشن پاؤں میں دبوچے پوری دلچسپی سے نگاہیں اسکرین پہ جمائے بیٹھی تھی۔ رابعہ نے دروازے سے اندر جھانک کر بغور اس کی سرگرمی ملاحظہ کی اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"یہ لڑتی بھڑتی عورتوں کو اتنے انہماک سے دیکھ رہی ہے، اپنی ہی صنف کی بے وقعتی۔ چ چ چ۔"

اسریٰ کو پتا تھا، اب آپی کی توپوں کا رخ یقیناً اس کی پڑھائی کی طرف ہوگا۔ اس نے فوراً چینل بدل دیا۔ وہاں ایک ماڈل گرل اپنے زریں خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

"پاکستان میں ماڈلنگ کے شعبے میں اب بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہماری ماڈل گرلز کسی طرح بھی دوسرے ملک کی ماڈلز سے پیچھے نہیں ہیں۔"

"اس کا لباس دیکھ کر ہی "ترقی" کا اظہار ہو رہا ہے۔" رابعہ اندر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اسریٰ نے جھلا کر ٹی وی بند کر دیا۔

"پتا ہے آج شام کو بڑے ابا گاؤں سے آ رہے ہیں۔"

"تو!" اس کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

"میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔ امی نے کہا ہے کہ رات کے کھانے کا اہتمام کر لینا۔ اب اٹھو فوراً میرے ساتھ کچن میں آؤ اور ہیلپ کرو، شکر ہے چار ڈشز اضافی ہوں گی۔ تم مجھے پیاز کاٹ دینا، سویٹ ڈش کی ڈریسنگ کر دینا، سبزیاں اور گوشت دھو دینا، تمہارا یہی احسان عظیم

ہو گا مجھ نا چیز پہ۔"
"مستقبل کی عظیم اور نامور ڈاکٹر کی یہ بے عزتی، اس سے کچن میں کام کروایا جا رہا ہے۔" مصنوعی تاسف سے منہ بسورنے لگی۔
رابعہ چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس سے باتیں بھی کرتی رہی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کی مطلوبہ ڈشز تیار ہو گئیں۔
"گڈ! اب پلاؤ رائتہ اور سلاد رہتا ہے۔ وہ رات کو بنا لیں گے۔ کباب بھی رات میں تلیں گے۔" رابعہ نے اطمینان کا سانس لیا۔
"پتا ہے، مجھے بڑے ابا بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا دل کرتا ہے، کاش دادا دادی بھی زندہ ہوتیں۔ میں گاؤں جاتی، ان کے پاس رہتی، رات کو ان کے پاس سوتی اور پرانے وقتوں کے قصے سنتی۔ جب آسمان ہر طرح کی آلودگی سے پاک، صاف شفاف اور نیلا ہوتا تھا اور جب نیلی پریاں چھم سے ہر گھر میں اترا کرتیں۔" وہ آنکھیں موندے بولتی جا رہی تھی۔
"اسریٰ! کبھی کبھی تو تم مجھے ڈاکٹر کے بجائے شاعرہ لگتی ہو۔ یوں لگتا ہے تم صدیوں پہلے کے ماحول اور دنیا میں رہتی ہو۔ تمہاری روح ماضی کے کھنڈروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ میری جان! نیکی کی پریاں تو صرف قصے کہانیوں میں ہوتی ہیں۔"
"تو کیا ہوا، میں ان سے ماضی کی کہانیاں اور قصے ہی سن لیتی۔" اس کا لہجہ ابھی تک خوابناک سا تھا۔
اسریٰ! تم حد سے زیادہ تصوراتی ہو، حساس ہو۔ تمہارے خیالات اتنے نرم و نازک ہیں کہ چھوتے ہی لگتا ہے، حقیقت کی گرم بے رحم فضا میں جھلس جائیں گے۔
تم جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں
حقیقت کی دنیا میں رہنا سیکھ لیا تو آئندہ تمہیں کوئی محرومی تنگ نہیں کر سکے گی۔ مجھے پتا ہے، تمہاری ان تمام باتوں کے پس پردہ کیا کچھ ہے۔"
رابعہ کا لہجہ از خود بھاری سا ہو گیا تو اسریٰ فوراً سابقہ کیفیت کے حصار سے نکلی۔
"چھوڑیں بھی، میں نے تو یونہی ایک عام سی بات کی تھی۔ آپ نہ جانے کہاں پہنچ گئیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ بڑے ابا کے آنے پہ کتنا مزا آئے گا تا۔ میں جو بھی ایگزام سے

فارغ ہوئی تو گاؤں جاؤں گی اور مزے سے گھوموں پھروں گی۔" رابعہ مسکرا دی۔ اسریٰ کی پل پل بدلنے والی فطرت کبھی کبھی اسے بے انتہا مضطرب کر دیتی تھی۔

بڑے ابا سے وہ اتنے والہانہ انداز میں ملی کہ ایک تانیے کے لیے وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ بڑے ابا حسب معمول اپنے پروقار اور لیے دیے سے انداز میں ملے۔ رابعہ کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ ابھی تک ان کے دائیں بازو کے گھیرے میں تھی۔ رابعہ سلام دعا اور سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد کچن میں چلی آئی جب اسریٰ ابھی تک بڑے ابا کے پاس بیٹھی باتیں بگھار رہی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ بڑے ابا اور ہاشم گیلانی دونوں آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے اسریٰ دو بار جھانک چکی تھی۔ رابعہ کچن کا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے آواز دے کر اسریٰ کو اپنے پاس بلایا تو وہ بدمزا سی ہو گئی۔

"بتائیں، کیا کام ہے؟" ناگواری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ پہلے ہی بڑے ابا اور ابو کی دبیہ سے جو آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے، چند الفاظ اس کے کان میں بھی پڑے تھے۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی کیونکہ بڑے ابا کا لہجہ بہت تلخ سا تھا۔ اسے باہر سے گزرتے دیکھ کر دروازہ بند کر لیا گیا تو وہ الجھ سی گئی۔ اسی اثناء میں رابعہ کی آواز اس کے کان میں آئی تو کوشش کے باوجود وہ اپنا غصہ چھپا نہ سکی۔

"کیا بات ہے، صورت شریف پہ بارہ کیوں بجے ہیں؟"

"آپ نے کیوں بلوایا ہے؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

رابعہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور دسان سے بولی۔ "میں نے سارا کام ختم کر لیا ہے۔ آؤ اب دونوں واک کر آتے ہیں۔" اس نے اتنے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا کہ اسریٰ شرمندہ سی ہو گئی۔ ڈرائنگ روم سے آتی آوازیں قدرے بلند ہوئیں تو رابعہ گھبرا گئی۔

"اسریٰ! آج چاند کی بارہ تاریخ ہے مگر اس کی چاندنی اور ٹھنڈک تو دیکھو۔ تمہیں چاند بہت پسند ہے نا۔"

"ہاں آپی! مجھے تنہا چاند بہت اچھا لگتا ہے۔" اسریٰ کے لہجے سے دبی دبی حسرت جھلک رہی تھی۔ رابعہ ٹھٹک گئی۔

"کم ان اسریٰ! یوں مت کہا کرو، اتنی قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ ایک مزے کی بات

بتاؤں۔" وہ قصداً سسپنس پھیلا رہی تھی۔

"بتائیں نا، میں سن رہی ہوں۔"

"ماموں خاور کا فون آیا تھا۔ ان کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ ہم دونوں کو انوائٹ کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہائے سچ! مگر مجھے کس خوشی میں کباب میں ہڈی بنا رہے ہیں۔" رابعہ کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔ اسریٰ نے ایک دم موڈ بدلا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر ہنس لیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں تو بڑے ابا اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ جو گیٹ کے پاس منتظر سے کھڑے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے گاڑی دھول اڑاتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ شہباز گیلانی نے جاتے ہوئے اسریٰ اور رابعہ سے ملتے جانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ ان دونوں کو دیکھ چکے تھے۔

"ابو جان! کیا بات ہے۔ یہ بڑے ابا اس وقت کیوں چلے گئے۔ آپ نے روکا کیوں نہیں؟ پورے ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے، اتنی دیر سے پہنچیں گے۔"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو ہاشم زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولے۔

"وہ دیہاتی ماحول کے عادی ہیں۔ میں نے بہت کہا رات کو رک جائیں مگر نہیں مانے۔"

رابعہ آسانی سے بہلنے والی نہیں تھی مگر مصلحتاً خاموش ہو گئی کیونکہ اسریٰ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے سوال جواب مناسب نہیں تھے۔

❁

اس مقامی ہاسپٹل میں آج اسریٰ کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے ہاسپٹل پہنچتے ہی گھر فون کیا۔ رابعہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ بہن کا فون سننے کے بعد وہ مطمئن سی ہو گئی۔ ابو اسٹڈی روم میں تھے۔ باقی کا ڈرامہ اس نے پوری دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ابھی بستر پر لیٹنے لگی تھی جب بڑے ابا کا فون آیا۔

ہاشم دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن رہے تھے۔

"ہاشم! میں آخری بار کہہ رہا ہوں، آج کے بعد میں سمجھوں گا تم میرے لیے مر چکے ہو۔" وہ اتنی سفاکی سے کہہ رہے تھے کہ ہاشم کو اپنا سانس سینے میں رکتا محسوس ہوا۔ دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہیں ڈھے گئے۔ دل کی

بیماری انہیں تین چار برسوں سے لاحق تھی، مگر اس وقت رابعہ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ سینے کو بری طرح مسل رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی دوائی لانے کو کہا۔ وہ واپس آئی تو ان کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا اور آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ رابعہ نے جلدی سے ابو کے قریبی دوست جواد لطیف کو فون کر کے ان کی حالت سے آگاہ کیا۔ وہ پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر کے ساتھ آ گئے۔ ڈاکٹر نے فوراً ہاسپٹل لے جانے کا مشورہ دیا۔

رابعہ نے اسریٰ کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بہت زیادہ پریشان ہو جاتی تھی اور پھر امی کے بعد وہ ابو کے لیے بہت حساس ہو گئی تھی۔ گھر سے قریبی ہاسپٹل میں ہاشم گیلانی کو جواد لطیف نے وقت ضائع کیے بغیر ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ رابعہ صبح تک وہیں رہی۔ گھر، ملازم اور چوکیدار کے حوالے تھا جو بڑے ابا نے گاؤں سے بھیجے تھے۔ بے حد قابل اعتماد اور وفادار۔ درحقیقت ملازم رحیم اور چوکیدار فیض بخش، شہباز گیلانی کے ایک طرح سے جاسوس ہی تھے۔ تین برس پہلے انہوں نے ضد کر کے خدمت کے بہانے ہاشم کے پاس رکھوائے تھے۔ انہوں نے احترام کی وجہ سے چپ سادھ لی، ورنہ کہہ سکتے تھے شہر میں ملازمین کی کمی تو نہیں ہے۔ گھر کے اکثر کام رابعہ نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ ہاشم فارن سروس میں تھے، ملکوں ملکوں گھومنے کی وجہ سے ان سب کو اپنا کام خود کرنے کی عادت تھی۔ رابعہ نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلومہ لے رکھا تھا۔ چھ ماہ پہلے ہاشم نے جواد لطیف کے بیٹے خاور سے اس کی منگنی کر دی تھی۔ اس رشتے پر ان کے خاندان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ شہباز گیلانی کئی بار اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔

صبح ہی صبح ہاشم گیلانی کے گھر کے آگے تین گاڑیاں آ کر رکیں۔ یہ سب گاؤں سے آئے تھے۔ رابعہ کو خاور نے بڑی مشکل سے گھر بھیجا تھا وہ خود ہاسپٹل میں تھا۔ بڑے ابا کے ساتھ دونوں چچا، ان کی بیٹیاں اور تین بیٹے بھی تھے۔ بڑے ابا کی بیٹی زرین بھی آئی تھی رابعہ نے ان کی خاطر مدارات کرنے کی کوشش کی مگر بڑے ابا نے اسے روک دیا۔

"یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ عورتیں یہیں رکیں گی۔ اگر ہاشم کی طبیعت میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیئے تو پھر یہ بھی آ جائیں گی اور تم فکر مت کرنا۔" دل خراش الفاظ سے انہوں نے تو جیسے اس کا سینہ چیر دیا۔ کتنے آرام سے کہہ دیا طبیعت

میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیے تو......

"اللہ نہ کرے جو ابو کو کچھ ہو۔" اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔ کبھی کبھی بڑے ابا اسے سنگ دلی کی انتہاؤں کو چھوتے نظر آتے تھے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔

اس نے اسریٰ کو بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی گھر آ گئی تھی۔

زرین اسریٰ کو بڑے غور سے تولتی اور کھوجتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ "یہ تو چادر سر پہ لیتی ہے۔" اس نے سلطانہ خاتون سے سرگوشی کی۔ وہ بھی بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسریٰ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ رابعہ، خاور سے مسلسل رابطے میں تھی۔

"آپی! میں ہاسپٹل جا رہی ہوں۔" اس نے متفکر بیٹھی رابعہ کو بتایا اور ان سب کی طرف آئی۔ "آپ لوگ آپی کی میزبانی سے فیض یاب ہوں، کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔" وہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح عجلت میں چلی گئی۔

دو دن بعد ہاشم گیلانی کو ہاسپٹل سے فارغ کر دیا گیا۔

اس دوران بڑے ابو، دونوں چچا اور ان کے بیٹے وہیں رہے تھے۔ زرین اور دوسری خواتین گاؤں واپس چلی گئی تھیں۔

اسریٰ، ہاشم صاحب کے لیے سوپ لے کر آ رہی تھی کہ بڑے ابا کی تیز آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"ہاشم! مجھے جلد از جلد جواب چاہیے۔" اسریٰ اندر داخل ہوئی تو شہباز گیلانی کے چہرے کی سلوٹیں فوراً دور ہو گئیں۔ وہ اسے دیکھ شفقت سے مسکرائے۔ اسریٰ، ابو کے سرہانے بیٹھ گئی، ان کی آنکھیں بند اور سر نڈھال سے انداز میں تکیے پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ابو کے ماتھے پہ اپنا ہاتھ رکھا تو انہوں نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"ابو! سوپ پی لیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پہ شہباز بھی ہاشم کے پاس بیٹھ گئے اور اسریٰ کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔

"تم ہٹو، میں خود پلاتا ہوں۔" اس نے بڑے ابا کی طرف دیکھا۔ کتنی جلدی وہ تیور بدل لیتے تھے۔

ہاشم نے آدھا پیالہ پینے کے بعد ہاتھ سے پیالہ ہٹا دیا۔

شہباز نے ٹشو پیپر سے ان کے ہونٹ اور منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ "جلدی سے

ٹھیک ہو جاؤ، ہم سب کو تمہاری تندرستی کی ضرورت ہے۔ کیوں امرتی بیٹی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا جیسے ہی ہم جائے تو میں تمہاری شادی کی تاریخ رکھوں اور تم تو ایک مہینہ پہلے آؤ گی۔ خوب اچھی طرح سے تم پھر گاؤں بھی دیکھ لینا اور ہم لوگوں کا رہن سہن بھی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ جب تم ہاؤس جاب مکمل کر لو تو ادھر گاؤں کے ہاسپٹل میں ہی آ جاؤ۔ وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

امرتی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

شہباز گیلانی کچھ دیر بعد چلے گئے۔

رابعہ اور امرتی دونوں ہاشم صاحب کے پاس بیٹھ گئیں۔

"اب آپ مکمل ریسٹ کریں گے۔ اگر کہیں کوتاہی ہوئی تو میں آپ سے بولنا چھوڑ دوں گی۔" امرتی نے دھمکی دی۔ وہ مسکرا دیے اور اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ رفتہ رفتہ پہلے کی طرح تندرست نظر آنے کی پوری کوششیں کر رہے تھے، انہیں احساس تھا کہ امرتی اور رابعہ ان کی وجہ سے کتنی پریشان رہتی ہیں۔

وہ ڈیوٹی روم میں ساتھی ڈاکٹرز شہلا اور صدف کے ساتھ چائے پی رہی تھی، جب ہی وہاں ڈاکٹر حمزہ بھی آ گئے۔

"مجھے پتا تھا یہاں چائے ہی پی جا رہی ہے چوری چھپے۔" انہوں نے بڑے آرام سے چوتھا کپ اٹھا لیا جو ڈاکٹر صبیحہ کے لیے تھا۔ چائے ختم کر کے امرتی اٹھ کھڑی ہوئی تو ڈاکٹر حمزہ سمیت ان دونوں نے بھی اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں ذرا وی آئی پی وارڈ میں جا رہی تھی۔ آٹھ نمبر روم میں پیشنٹ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی ہیں، جا کے دیکھ لوں۔" وہ سر پہ اسکارف درست کرتی ڈیوٹی روم سے باہر نکلی۔

اس کی نرم دلی اور ہمدرد فطرت کے باعث اکثر لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمزہ کو تو وہ اسی رنگ میں بھانے لگی تھی، اچھی ہی لگنے لگی تھی۔

وارڈ میں مریضوں کو دیکھتی وہ بڑی ذمہ داری میں بنے آخری کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ یہ روم نمبر بائیس تھا۔ امرتی کے ساتھ دو نرسیں بھی تھیں۔

"ہاں بھئی، کیسے ہیں آپ؟ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟"

امرتی نے مریض کے سرہانے کھڑے ہوتے ہوئے خوش اخلاقی سے پوچھا اور پھر

اس کی کیس فائل کا جائزہ لینے لگی۔ دوسری طرف دنیا جہان کا شوق آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

"پہلے تو نہیں مگر اب کافی بہتر محسوس ہونے لگا ہے۔" زیاد آرام سے بولا۔ اسریٰ نرس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی بات کو دھیان سے نہ سن سکی۔ "فریحہ! آپ ان کی ڈریسنگ دوبارہ کریں، اس میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔" پھر اس نے خود زیاد کے ٹوٹے بازو اور پسلیوں کا جائزہ لیا۔

"آپ تو بہت باحوصلہ اور مضبوط ہیں۔ سرجن افتخار احمد آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔" اسریٰ نے اس کے پٹیوں میں جکڑے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

تین دن پہلے وہ شدید زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ اس کی تین پسلیاں اور بایاں بازو ٹوٹ چکا تھا۔ گردن کے آس پاس کا نازک حصہ بھی زخمی تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اسریٰ کو دیکھا تھا۔ اسے وہی اسید کر رہی تھی۔ کوئی کوئی لمحہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اچھا بھلا انسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ شدید زخمی حالت میں ہونے کے باوجود زیاد چوہدری کی زندگی میں بھی یہ لمحہ آ چکا تھا۔ اسے ڈاکٹر اسریٰ کی مسیحائی اچھی لگی تھی۔ زیاد نے آنکھوں سے چھلکتی وارفتگی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اسریٰ کی آج پھر نائٹ ڈیوٹی تھی۔ گزشتہ تین چار روز سے روم نمبر بائیس کے مریض نے اسے عاجز کر کے رکھ دیا تھا۔ نرسیں اور دیگر اسٹاف دبی دبی آواز میں اسی کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے۔ آج اس کا پکا ارادہ تھا، کسی صورت میں بھی روم نمبر بائیس کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس شخص کے بیباک جملے اور نگاہیں کم از کم اب اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ رات ڈیوٹی کے دوران وہ اپنے ارادے کے مطابق روم نمبر بائیس میں نہیں گئی اور اس کا نتیجہ دوسرے روز بڑے تلخ انداز میں نکلا۔

سینئر ڈاکٹر افتخار اور سرجن نصیر خان نے اسے سخت انداز میں ڈانٹا۔

"ڈاکٹر اسریٰ! آپ تو مسیحائی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ مریض کیا ہے، کون ہے، کیسا ہے، اس سے قطع نظر آپ کو صرف اپنے فرض سے مطلب ہونا چاہیے۔ آئندہ میں کوئی شکایت نہ سنوں۔" اسریٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ایک نرس نے ڈاکٹرز کی موجودگی میں اسریٰ سے کہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! نمبر بائیس کا پیشنٹ بہت شور کر رہا ہے، اس نے انجکشن بھی نہیں لگوایا اور دوا لینے سے بھی انکار کر رہا ہے اور ہماری ہدایات پہ کوئی عمل نہیں کر رہا ہے۔ اس بے احتیاطی

سے اسے نقصان ہی پہنچے گا۔ وہ کہہ رہا کہ ڈاکٹر اسریٰ ہی مجھے اٹینڈ کریں۔" شہلا اور صدف کے چہرے پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

"اسریٰ! بڑا ہینڈسم بندہ ہے، کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔ اس کا کمرہ ملاقاتیوں سے بھرا رہتا ہے اور نرس رخشندہ بتا رہی تھی کہ مہنگی مہنگی گاڑیوں میں لوگ اس کی عیادت کرنے آتے ہیں اور چھوٹے ملک صاحب، چوہدری صاحب کہتے ان کا منہ سوکھتا ہے۔"

صدف کے انداز میں شرارت صاف محسوس کی جا سکتی تھی مگر اسریٰ کو بہت برا لگا۔

وہ غصہ ضبط کرتی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دیکھتے ہی زیاد کے لب مسکرا اٹھے۔

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" اس نے اندرونی طیش چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"آپ کل کیوں نہیں آئیں اسریٰ!" اس نے لفظ "اسریٰ" خاصی بے تکلفی سے ادا کیا۔ ڈاکٹر کا سابقہ اس نے گول کر دیا تھا۔

"آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے یہ سوال کرنے والے۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کی وجہ سے میں کتنا عجیب محسوس کر رہی ہوں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا پھر اس نے بڑی شرافت سے اسریٰ کی موجودگی میں نرس سے انجکشن لگوایا اور میڈیسن لی۔

خلاف توقع اس کے ردعمل کو دیکھ کر اسریٰ بہت حیران ہوئی، کیونکہ اپنے تیور اور مزاج کی بدولت وہ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، اس نے سکون کا سانس لیا۔ چند روز بعد وہ ڈسچارج ہو کر چلا گیا۔

❁

بڑے ابا پھر آئے ہوئے تھے۔ اب کی بار ان کے ساتھ بڑی امی بھی تھیں۔ اسریٰ آج گھر پہ ہی تھی۔ رابعہ حسب معمول کچن میں تھی۔ اسریٰ اس کے پاس چلی آئی۔

"ہاشم! تم نے کہیں نہ کہیں بیٹیوں کی شادی کرنی ہی ہے پھر تمہیں اپنے جانے پہچانے لوگوں میں شادی کرنے پہ کیا اعتراض ہے۔ اس طرح تم اپنے بڑوں کی روایات سے قریب تر رہو گے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، بڑا بھائی ہوں۔ تمہارے باپ کی جگہ ہوں، غلط نہیں سوچوں گا۔ تم خود بیمار رہتے ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو، تمہارے بعد رابعہ اور اسریٰ کا کیا بنے گا، کون ان کے سر پہ ہاتھ رکھے گا۔" شہباز انہیں نفسیاتی ہتھکنڈوں سے پرچانے کی کوششیں

کر رہے تھے..... ان کی توقع کے عین مطابق ہاشم صاحب کے چہرے پر تذبذب کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔

"بھائی جان! رابعہ کی منگنی ہو چکی ہے اور اسریٰ کا ہاؤس جاب ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی اس بارے میں سوچنے سے معذور ہوں۔" انہوں نے رک رک کر جیسے اپنی مجبوری بیان کی مگر وہ وہ پھر بھی خاطر میں نہیں لائے.....

"تو کیا ہوا، منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔" وہ بکمال اطمینان سے بولے ہاشم صاحب نے انہیں زخمی نگاہوں سے دیکھا۔

"ہم زبان دے کر پھرتے نہیں ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے تو شہباز ان کی طرف جھک آئے۔

"میں بھی زبان دے کر مکرنے والوں کا نہیں۔ رابعہ نہ سہی، اسریٰ ہی سہی۔" ان کے لبوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ پہ حکم کی مہر لگی ہوئی تھی۔

"ہاں ہاشم! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سلطانہ خاتون نے شوہر کی حمایت ضروری سمجھی۔ وہ خود کو اس محاذ پہ بالکل تنہا محسوس کر رہے تھے۔ سینے میں بائیں طرف پھر انہیں درد اور گھٹن کے ساتھ بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

❁

"اسریٰ! آج فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر حمزہ نے اچانک ہی اس سے سوال کیا وہ چونک گئی۔ ڈیوٹی روم میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر حمزہ واحد شخص تھے جنہوں نے روم نمبر بائیس کے مریض کے معاملے میں اس کی حمایت کی تھی۔ اسریٰ ان کی ممنون تھی، بلکہ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر حمزہ بہت غیر محسوس انداز میں اس کی چھوٹی موٹی سی مشکلات حل کر چکے تھے۔ مریضوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت ہمدردانہ ہوتا تھا۔

پھر چائے پینے کے دوران ڈاکٹر حمزہ نے حیران کن سوال کیا۔

"اسریٰ! اگر میں اپنے گھر والوں کو آپ کے گھر بھجواؤں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟" وہ چائے پینا بھول کر پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی گئی۔ حمزہ مسکرائے تو اس نے ہڑبڑا کر نظریں جھکا لیں اور بجلی کی تیزی سے خوامخواہ ناخنوں سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" حمزہ اس کی اس کیفیت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

"جواب میرے ابو دیں گے۔" یہ کہہ کر وہاں رکی نہیں۔ حمزہ طمانیت سے مسکرائے۔ جاب کرتے ہوئے انہیں سات سال گزر چکے تھے۔ گھر والوں کی طرف سے ان پہ شادی کر لینے کے لیے بہت دباؤ تھا۔

حمزہ نے بارہا اس سے حال دل کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسریٰ کا لیا دیا رویہ آڑے آ گیا۔ آج ہمت کر کے انہوں نے یہ مشکل مرحلہ بھی طے کر لیا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اسریٰ کے والد اس کے پرپوزل کو رد نہیں کریں گے۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شرافت و نجابت میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔

حمزہ کے والدین نے بڑی خوبصورتی سے اپنا مدعا ہاشم گیلانی کے روبرو گوش گزار کیا۔ انہوں نے رسماً سوچنے کی مہلت مانگی۔ ورنہ دل سے وہ مکمل طور پہ راضی تھے۔ ڈاکٹر حمزہ سے تین چار بار پہلے بھی ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ ان کی شرافت اور مضبوط کردار کے مداح تھے۔ درحقیقت وہ اسریٰ کے لیے ایسے ہی شریک سفر کے متمنی تھے۔ بیٹھے بٹھائے ان کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ جلد از جلد وہ رابعہ اور اسریٰ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہے تھے کیونکہ شہباز گیلانی کے ارادے انہیں کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ سارا خاندان شہباز کا ہم نوا تھا، وہ کہاں تک اکیلے سب کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

اسریٰ نے ان کی خواہش پہ سر جھکا دیا تھا۔ حمزہ ایک آئیڈیل مرد تھے۔ پروقار، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے اخلاق و کردار کے مالک۔ جب دھیمے لہجے میں بولتے تو بے اختیار جی چاہتا، بس وہی بولتے رہیں اور باقی آوازیں معدوم ہو جائیں۔

حمزہ نے اس رات پہلی بار اسریٰ سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ ڈنر پہ ان کے گھر مدعو تھے۔

"اسریٰ بیٹی! حمزہ کو گھر دکھاؤ۔" ہاشم نے کہا تو وہ حمزہ کو لے کر باہر لان میں آ گئی۔

"یہ تمام پودے میں نے لگائے ہیں۔ یہ بوگن ویلیا اور سدا بہار کی باڑ کی دیکھ بھال صرف اور صرف میرا کمال ہے۔ یہ رنگ برنگے گلاب کے پھولوں کے پودے میں نے آپی کے ساتھ شہر بھر کی نرسریاں چھاننے کے بعد خریدے تھے۔ گملوں پہ پینٹ رابعہ آپی نے کیا ہے اور یہ جامن کا پیڑ آپ دیکھ رہے ہیں نا، بابا نے چھ سال پہلے لگایا تھا۔ اب اس میں بور آ رہا ہے۔ انشاء اللہ

پھل بھی لگے گا۔"

وہ سادہ سے لہجے میں یہ سب بتا رہی تھی۔ حمزہ یک ٹک اسے دیکھے گئے تو وہ جھینپ گئی۔

"کوئی بات ہے تم میں، میں ایسے ہی تو نہیں مر مٹا ہوں۔" وہ منگی ستون سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بدستور اسے دیکھے گئے۔

"آئیں، اندر چلتے ہیں۔" اسریٰ کو کوئی جائے قرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ سو اس نے اندر جانا چاہا۔ حمزہ مسکرانے لگے۔

"بہار کا موسم، ٹھنڈی میٹھی چاندنی سی رات ہو اور ایک دلربا کا ساتھ ہو تو کون کافر ہے جو اندر جانا پسند کرے گا۔"

حمزہ نے پہلی بار اس کے ہاتھ کو چھوا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پتھر کی بینچ پہ وہ حمزہ سے قدرے فاصلے پہ ٹک گئی۔ وہ دونوں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ حمزہ نے اسے اپنی بہت ساری پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کے بارے میں بتایا۔

"مجھے چاند سے چاندنی راتوں سے، بارش کی آواز سے، جاتی بہاروں کے موسم میں کھلنے والے جنگلی پھولوں سے عشق ہے۔ ہاں سردیوں کی بارش جانے کیوں مجھے اداس سا کر دیتی ہے۔ کچھ بکھری کٹی یادوں کے در وا کر دیتی ہے۔ ایسے میں اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا کھڑکیاں کھول کر میں بارش کی ٹپ ٹپ میں بہت کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اقبال بانو کی غزل داغ دل ہم کو یاد آنے لگے اور نیرہ نور کی آواز میں گائی گئی یہ نظم 'عشق ہمیں برباد نہ کر' بہت پسند ہیں۔ ریلیکس موڈ میں، میں اکثر غلام علی، اور اسے نیر کو سنتا ہوں۔ فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا مجھے ازبر ہو چکی ہے۔ منشا یاد کے افسانے میرے دل کو چھو جاتے ہیں۔ بنیادی طور پہ مجھے اپنی مٹی اور یہاں بسنے والوں سے عشق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کہیں بھی مروں، مجھے اپنی مٹی میں ہی دفنا جائے اور اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

حمزہ ویسی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تو وہ ہڑبڑا کر حمزہ کی آواز کے سحر سے باہر نکلی۔

"آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے اور آپ کی پسند، ناپسند شاعروں اور ادیبوں والی ہیں۔ اس وقت کہیں سے بھی نہیں لگ رہا ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔"

وہ یکدم چپ ہو گئے۔ چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔

"وہ بھی یہی کہتی تھی۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے اسریٰ نے الجھ کر حمزہ کو دیکھا۔

"وہ...... وہ میرا دوست تھا۔ وہ بھی بالکل یہی کہتا تھا۔" ان کا لہجہ بہت کھوکھلا سا تھا پھر انہوں نے بہت جلد خود کو نارمل کر لیا۔

"اسریٰ! تم بھی تو کچھ بولو! اپنے بارے میں بتاؤ۔" اسے بالکل خاموش دیکھ کر حمزہ نے اصرار کیا اسریٰ نے اپنی اداس شفاف بے ریا آنکھیں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

"آپی اور میں چھوٹے چھوٹے تھے جب امی نے دائمی جدائی ہمیں بخشی۔ ابو بتاتے ہیں کہ میں اس وقت ڈھائی سال کی تھی پھر ابو نے ہی جان سے...... ہمارا خیال رکھا۔ ان کے ساتھ ہم نے بہت سے ملکوں کی سیر کی۔ گزشتہ چھ سال سے ہم اب مستقل پاکستان میں ہیں۔ تین سال قبل ابو نے ریٹائرمنٹ لے لی اور تب ہی یہ گھر تعمیر کروایا۔ طرزِ تعمیر کے متعلق آپی اور میں نے ابو کو بہت اوٹ پٹانگ سے مشورے دیے۔ اگر ان پر عمل ہوتا تو یہاں گھر کم عجوبہ زیادہ لگتا جتنا اب ہے۔ البتہ فرنیچر، کلر اسکیم، کارپٹ، پردے، ڈیکوریشن سب ہماری پسند کے ہیں۔"

جھکی جھکی پلکوں سمیت وہ سیدھی حمزہ کے دل میں اتری جا رہی تھی۔

"ہمارے گھر میں بھی تمہاری پسند کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔" گزشتہ آدھے گھنٹے سے وہ اسریٰ کو آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے جو اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"اسریٰ! مجھے لڑکیوں اور عورتوں میں چالاکی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ ہاں میں ان کی سمجھداری کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے چالاکی اور ہوشیاری منفی صفت لگتی ہے۔ میرا خیال ہے لائف پارٹنر قدرے سادہ اور تھوڑی احمق ہو تو اچھی گزرتی ہے۔ دو اور دو چار کرنے والی بیویاں زہر لگتی ہیں۔ مجھے۔ تم بھی تو بہت سادہ مزاج ہو اسی لیے دل کو چھو گئی ہو اور جو چیز میرے دل کو چھو لے، میں ہمیشہ کے لیے اسے دل میں بند کر لیتا ہوں۔ اس قید پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

اسریٰ نے بے اختیاری میں سر ہلایا۔

حمزہ نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ "اوہ گاڈ! ساڑھے دس بجنے والے ہیں، باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں اب انکل سے اجازت لے کر چلوں گا۔" حمزہ اٹھ کھڑے ہوئے تو اسریٰ نے بھی ان کی تقلید میں ابو کی جانب قدم بڑھا دیے۔

رابعہ نے صبح سے خواہ مخواہ سسپنس پھیلایا ہوا تھا۔ پہلے اکیلی بازار گئی اور واپس آتے ہی کچن میں گھس گئی۔ اسریٰ کو اس نے کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ کوریئر سے سرخ گلابوں کا بکے اور کارڈ رابعہ نے وصول کیا تھا۔ تبھی گیٹ سے حمزہ گفٹ کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ رابعہ انہیں لیکر اسریٰ کے کمرے میں آ گئی۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اسریٰ! اب رابعہ کا پھیلایا ہوا سسپنس اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے اسریٰ کو سرپرائز دینے کے لیے چکر میں حمزہ کو بھی انوائٹ کر لیا تھا۔ اسریٰ نے بے تابی سے ریپر پھاڑ کر حمزہ کے دیے گفٹ کو کھولا۔

حمزہ نے اسے اس کے پسندیدہ شاعر ابن انشاء کی کتابوں کا سیٹ اور ایک سی ڈی دی تھی جس میں ابن انشاء کا کلام مختلف گلوکاروں نے گایا تھا۔

رابعہ نے اسے پھولوں کا بکے اور کارڈ تھمایا تو اس نے کارڈ کھولا۔ اندر خوبصورت اور صاف لکھائی میں نیک تمنائیں لکھی ہوئی تھی۔ آخر میں بھیجنے والے کے نام کی جگہ Only for you لکھا تھا۔ سرخ گلاب بھلا اسے کون بھیج سکتا تھا۔

"شاید صدف اور شہلا میں سے کسی نے سرپرائزنگ گفٹ بھیجا ہے مجھے۔" اس نے اندازہ لگایا اور پھول فوراً گلدان میں سجا دیے۔ حمزہ دلچسپی سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے۔ اسریٰ نے سی ڈی پلیئر آن کر کے حمزہ کی دی ہوئی سی ڈی لگائی۔

"اس میں تو سارے گانے ہی میرے فیورٹ ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

سچ مچ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ رابعہ نے ٹیبل سیٹ کر کے اسے بلایا تو وہ باہر آ گئی۔ کیک کاٹنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ابو کے منہ میں چھوٹا سا پیس ڈالا۔ وہ کچھ دیر کے بعد معذرت کر کے چلے گئے۔ وہ تینوں بیٹھے کافی دیر گپ شپ کرتے رہے، چھوٹی چھوٹی سی بے معنی باتیں۔ اسریٰ کے بچپن کے قصے، امی سے بچھڑنے کا دکھ، ابو کی بیماری، خاور سے رابعہ کی منگنی اسریٰ کی ہاؤس جاب اس کی عادات، متلون مزاجی، حساس فطرت، سب کچھ ہی تو زیر بحث آیا تھا۔

دوسرے روز اسریٰ نے صدف اور شہلا سے پوچھا۔

"مجھے پھول اور کارڈ کس نے بھجوایا تھا؟" ان دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔ بھلا سرخ گلاب اور کون بھجوا سکتا ہے؟ سرخ گلاب جو بھیجنے والے کی شدت اور

محبت کا اظہار کر رہے تھے۔اس نے بڑی مشکل سے سوالوں کو ذہن سے جھٹکا تھا۔

کچھ کہنا چاہیں تم سے

ڈرتے ہیں برا نہ مانو

ہم ملنا چاہیں تم سے

ڈرتے ہیں بچھڑ نہ جاؤ

تو ہے ہر گھڑی سپنا میرا

تو ہے ہر گھڑی اپنا میرا

میری دھڑکنیں سنگیت ہیں

تیری چاہت تیرے پیار میں

بس ایک بار او میرے یار

دل رکھنے کو کہہ دے پیار

اسریٰ کو آج پھر کوریئر نے ریپر میں لپٹا چھوٹا سا پیکٹ دیا تھا۔فیصل لطیف کے گانوں کے ساتھ ایک کارڈ بھی تھا جس پر خوبصورت لکھائی میں پہلے کی طرح only for you لکھا ہوا تھا۔

پوری کیسٹ میں یہی ایک گانا ریکارڈ تھا۔اب کے وہ سچ مچ تجسس اور پریشان تھی۔

رابعہ کو بھی اس نے بتا دیا تو وہ آرام سے بولی۔

"حمزہ بھائی ہی یہ ڈرامہ کر رہے ہوں گے تاکہ جلد از جلد تم ان کے آنگن میں جلوہ افروز ہو سکو۔" اسریٰ کے گال گلابی سے سرخ ہو گئے۔وہ کچھ دیر پہلے کی الجھن اور تجسس فراموش کر گئی جو کوریئر سے پیکٹ وصول کرتے ہوئے اسے لاحق تھا۔

"تم خواہ مخواہ اتنا پریشان ہو رہی ہو۔مجھے سو فیصد یقین ہے یہ حرکت حمزہ بھائی کی ہے۔ابو کل جواد انکل سے کہہ رہے تھے کہ بہت جلد وہ تمہارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لیں مگر انہوں نے اس بات کو یہ کہہ کر اہمیت نہیں دی کہ حمزہ بہت اچھا شخص ہے۔مجھے واثق امید ہے کہ میری رخصتی پہ تمہارا معاملہ بھی نمٹ جائے گا۔"

"مگر ابھی تو میرا ہاؤس جاب بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔" وہ منمنائی۔

"اسریٰ! ابو ہماری طرف سے بہت پریشان ہیں۔جانے کیا بات ہے بڑا ابا۔" رابعہ نے یکدم خیال آنے پر زبان دانتوں تلے دبا کر باقی الفاظ کا گلا گھونٹ دیا اور کمرے سے باہر

چلی گئی۔ تب ہی اسریٰ کا موبائل بج اٹھا۔ دوسری طرف حمزہ تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے۔

''امی اور بھابھی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ ہمارے گھر کا وزٹ کرنے کے بارے بھی خیال ہے یا ایک بار ہی آنے کا ارادہ ہے؟'' وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کے لیے کبھی کبھار اچانک شوخ ہو جاتے تھے۔ اسریٰ نظر انداز کر گئی۔ اچانک رابعہ کی بات اسے یاد آ گئی۔ اس نے فوراً پوچھ ڈالا۔

''آپ نے میری برتھ ڈے پہ ڈھیروں سرخ گلاب بھجوائے تھے؟''

''ارے نہیں بھئی، مجھے بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔ خود جو بہ نفس نفیس آ گیا تھا۔ ویسے بات کیا ہے؟''

حمزہ کا لہجہ سچائی و سادگی لیے ہوئے تھا وہ پھر الجھنوں میں گھر گئی۔ ''بس ویسے ہی کہہ رہی تھی مذاق کر رہی تھی۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

حمزہ نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا فون بند کر دیا۔

❁

ہاشم گیلانی نے رابعہ کی شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ اسریٰ آتے جاتے اسے چھیڑتی تو وہ رونے لگتی تھی۔ خوشی اور غم کا کیسا ملاپ تھا جو آنکھیں نم کیے جا رہا تھا۔ رابعہ کی مہندی پہ اس کے سارے ددھیال والے جمع تھے ہاشم صاحب نے بڑی جرات سے کام لیتے ہوئے شہباز کو حمزہ کے پروپوزل کے بارے میں بتایا۔

''بھائی جان! میں چاہتا ہوں کہ رابعہ کی رخصتی پہ اسریٰ اور حمزہ کے رشتے کا اعلان کر دوں۔'' شہباز نے بڑی مشکل سے دل و دماغ سے امڈتے غصے و خفگی کے سیلاب پہ بند باندھا تھا۔

''یار! اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں۔ ویسے میں تم سے بہت ناراض ہوں، تم نے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ سارے ہی بالا ہی بالا تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں اور کہہ رہے ہو رشتے کا اعلان کر دوں۔ اسریٰ میری بھی بیٹی ہے اتنی عجلت کیوں کر رہے ہو۔ خوب دھوم دھام سے منگنی ہو گی اسریٰ کی۔ ابھی چند دن ٹھہر جاؤ۔''

ہاشم صاحب انہیں دیکھتے رہ گئے شہباز نے انہیں بولنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔

دولہا والوں کی آؤ بھگت کا انتظام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ اسریٰ الگ بولائی ہوئی تھی سارے لوگوں سے ملنے کا تجربہ اس کے لیے نیا تھا۔

رابعہ کو بیوٹیشن گھر پہ تیار کرنے آئی تھی۔ میک اپ کا مرحلہ تمام ہونے کے بعد اسریٰ، شہلا اور صدف کے ساتھ رابعہ کو ہوٹل لے کر آئی تو پتا چلا کہ رابعہ کے عروسی سوٹ سے میچ کرتا پاؤچ گھر پہ ہی رہ گیا ہے۔ وہ رو نکھی ہوگئی گزشتہ چھ سات دنوں میں اسے ایک پل بھی آرام کے لیے نہیں ملا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہوٹل کے اندرونی گیٹ سے باہر آئی۔ ہائی ہیل کی جوتی میں وہ بھاگنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ زیاد کے قدم اسے دیکھ کر وہیں رک سے گئے گہرے نیلے اور فیروزی منقش لمبے سوٹ میں ملبوس نک سک سے تیار وہ بڑی دل آویز لگ رہی تھی۔ اسریٰ کو کسی کی نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا۔ سر جھٹک کر وہ پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپسی ہوئی۔ پاؤچ رابعہ کے ہاتھ میں تھما کر اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ حمزہ اپنی پوری فیملی سمیت آئے تھے۔ صدف اور شہلا بھی مہمانوں کی صف میں بیٹھی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

رخصتی کے وقت رابعہ اور اسریٰ ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب روئیں۔ ہاشم صاحب، شہباز اور دوسرے بھائیوں کی فیملی کے ساتھ گھر آگئے۔ اسریٰ ابھی تک ایک طرف یاسیت و اداسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ہاشم صاحب بڑے ابا کے ساتھ اندر چلے گئے۔

"بھائی جان! آج میں نے آپ کے مشورے کو اولیت دی ہے اور اسریٰ کی حمزہ کے ساتھ منگنی وقتی طور پہ ملتوی کر دی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کب یہ نیک فریضہ سرانجام دیا جائے کیونکہ میں نکاح بھی ساتھ کر دینا چاہتا ہوں۔ رخصتی اسریٰ کی ہاؤس جاب کے بعد ہو جائے گی۔"

انہوں نے چائے کی پیالی شہباز کی طرف بڑھائی مگر انہوں نے نہیں لی اور سرد و جامد نگاہوں سے ہاشم صاحب کو دیکھنے لگے۔

"اسریٰ کی منگنی نہیں ہوگی۔ نکاح ہوگا، نکاح۔ وہ بھی حمزہ کے ساتھ نہیں، یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ رابعہ کی بار تو میں خاموش ہوگیا تھا مگر اس بار نہیں۔ میں پچھلے حساب بھی برابر کر دوں گا۔ یہ نہ ہو کہ صبح کا سورج اس خبر کے ساتھ طلوع ہو کہ ہاشم گیلانی کا داماد خاور جواد شادی کی صبح پراسرار طور پہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا اور اس قتل میں خاور جواد کی بیوہ رابعہ گیلانی کا ہاتھ ہے جس نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر ایک شب کے دولہا کو زندگی سے محروم کر دیا۔"

شہباز گیلانی اس وقت ایک درندے کے روپ میں نظر آ رہے تھے۔

"بھائی جان! آپ ایسا نہیں کر سکتے، نہیں کر سکتے۔" ہاشم کی زبان سے بمشکل تمام اٹک اٹک کر ایک جملہ ادا ہوا۔ بیٹے کو سلتے وہ وہیں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ گھٹی گھٹی چیخیں غیر ارادی طور پہ ان کے حلق سے نکل رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ چیخیں معدوم ہو گئیں۔ ان کے لبوں پہ صرف تھرتھراہٹ تھی۔

شہباز نے وہیں سے اسریٰ کو آواز دی۔ اسریٰ بھاگتی ہوئی آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم جامد ہو گئے۔

پہلی نگاہ میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے جو معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔

اگلی صبح ہاشم گیلانی کی روح دنیا کے تمام جھمیلوں سے آزاد ہو گئی۔ ایک کرب مسلسل جو کئی برس تک ان کا ساتھی رہا تھا، جسم سے جان کا رشتہ منقطع ہونے کے بعد ان کا پیچھا چھوڑ گیا تھا۔

ہاشم گیلانی کے سرہانے بیٹھی دیوانگی کے عالم میں وہ ان کے بے جان نقوش کو دل میں اتار رہی تھی۔ وہ رات سے اسی جگہ اسی پوزیشن میں بیٹھی۔ رابعہ صدمے سے نیم جان سی ہو رہی تھی۔

اسریٰ ہمیشہ سے رابعہ ہمیشہ سے کم ہمت اور بزدل لگتی آئی تھی، حیرت انگیز طور پہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ حمزہ کا دل خود دکھ سے بوجھل سا تھا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو رابعہ نڈھال ہو کر فرشی دری پہ گر گئی۔

اسریٰ نے بہن کا سر اٹھا کر اپنے زانو پہ رکھا۔ چند سیکنڈ کی کوشش سے وہ ہوش میں آ گئی۔ اسریٰ کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

"آپی! اب آپ چپ ہو جائیں، ہمیں خود ہی نمٹنا ہے۔ گھنی چھاؤں ہمارے سروں سے ہٹ چکی ہے۔ ہم بے رحم دھوپ کے سپرد ہیں۔" حیرت انگیز طور پہ اس کا لہجہ بہت سرد اور پرسکون سا تھا۔

حمزہ نے اسریٰ کی نگاہوں میں مچلتے سیل رواں کو دیکھا۔

شہباز گیلانی نے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر ہاشم کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا۔

"حماد نے ہاشم انکل کی ناگہانی وفات کی وجہ سے سیٹ کینسل کروا دی تھی۔ وہ کویت میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رابعہ کو بھی جانا تھا۔ جواد لطیف نے اسے سمجھا

بہتر ہے ڈیڑھ دو مہینے بعد وہ رابعہ کو اس کے پاس بھجوا دیں گے، ابھی اس کا جانا مناسب نہیں ہے۔
امبرین نے کوشش کی کہ رابعہ بھی خاور کے ساتھ چلی جائے مگر وہ کسی طور راضی نہیں ہو رہی تھی۔
"میں چلی گئی تو تم کیا کرو گی، تم اکیلی رہ گئی ہو امبرین!! لگ کر بالکل تنہا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" وہ جذباتی کیفیت میں بولی۔ امبرین نے اپنے سارے آنسو دل میں اتار لیے اگر وہ اس موقع پر ذرا بھی کمزوری دکھاتی تو رابعہ کی ہمت بھی ٹوٹ جاتی۔
"رابعہ! میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ بڑے ابا ہیں۔ چچا ہیں۔ میرا اپنا خاندان ہے پھر حمزہ بھی تو ہیں۔" رابعہ نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔
بڑے ابا اور دونوں چچا ابھی تک یہیں تھے سوئم کے بعد شہباز گیلانی نے ان دونوں بہنوں سے بات کی۔
"تم میرے ساتھ گاؤں چلو، وہاں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ وہ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے دکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔" شہباز نے رابعہ اور امبرین کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔
"بھلا یہاں اب کیا رکھا ہے۔ ہاشم تو ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آنے کا کبھی بھی نہیں۔" ان کے ساتھ رابعہ بھی پھر رونے لگی۔ مگر امبرین نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ دیں۔
"بڑے ابا! اگر میں گاؤں چلی گئی تو میرے ہاؤس جاب کا کیا بنے گا ویسے بھی اب مہینے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلے کافی چھٹیاں کر لی ہے۔" اس کا لہجہ بے تاثر مگر پر اعتماد تھا۔
"تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ چلو ایسے کرو۔ دو تین دن کے لیے گاؤں آ جاؤ۔ پھر واپس چلی آنا۔ چاہو تو ہر چھٹی کے دن آتی جاتی رہنا۔ یہاں میں تمہارے پاس زرین اور ایک ملازم کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اضافی چوکیدار میں گاؤں سے بھجوا دوں گا تاکہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔" ان کا بھاری ہاتھ امبرین کے سر پہ دھرا تھا۔ اس نے ان کی کسی بات سے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔
رابعہ ان کے ساتھ گاؤں چلی گئی۔ شہباز نے اپنے وعدے کے مطابق ایک چوکیدار، ملازم اور زرین کے ساتھ ایک بے حد قابل اعتماد اور وفادار ملازم سفیان کو بھی

تھا جو اسریٰ کی حفاظت اور گھر کی دیکھ بھال پہ مامور تھا۔ بقول شہباز کے کہ ایسا اسریٰ کی تنہائی کے خیال سے کیا گیا تھا۔

وہ سب کو اس گھر میں برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ زرین ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتی جو بھی وہ ہاسپٹل سے آتی۔ زرین اسے گھیر کر بیٹھ جاتی۔ اپنی کچھ خامیوں کے باوجود اس کو وہ اچھی لگی تھی۔

زرین نے اسے حویلی، گاؤں اپنے رشتہ داروں اور اپنی والدہ کے بارے میں ڈھیروں باتیں بتائیں تھی۔ زرین کا خالص انداز اسریٰ کو اچھا لگا تھا بلکہ اس نے تو اسریٰ کو اپنے ایک بہت ہی خاص راز میں بھی شریک کر لیا تھا۔

"اسریٰ! وہ بہت اچھا ہے۔ قدرے ضدی اور خود سر سا۔ پتا ہے سفید حویلی والے جلد ہی ہمارے خاندان سے ایک نیا رشتہ جوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں شاید اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین دشمنی کی فصیل گرائی جا سکے جو برس ہا برس سے بہت بلند ہو رہی ہے اگر ایسا ہو جائے تو شاید میری آرزو بھی پوری ہو جائے کیونکہ وہ دوبار اپنے بڑوں کے ساتھ ہمارے حویلی آچکا ہے۔ ہمارے مرد بھی اس کی عیادت کو گئے تھے۔ چند ماہ پہلے اس کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسریٰ بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔
"اگر وہ تمہیں نہ ملے تو پھر تم کیا کرو گی۔ مثال کے طور پہ اگر دونوں خاندانوں کی صلح نہ ہوئی تو پھر؟"

"ایسے نہ کہو کیونکہ ابا جان کو صلح کرنی ہی پڑے گی۔ اگر اس کے لیے مجھے اپنی جائیداد بھی چھوڑنی پڑی تو میں چھوڑ دوں گی۔ ویسے آج کل اسی بارے میں بحث چل رہی ہے چچا جان کا خیال ہے کہ اگر ہم نے اپنی بیٹی ان کو دے دی تو اس میں توہین کا پہلو ہے۔ مجھے تو اس میں توہین کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا مجھے یہ خواہ مخواہ کی خود ساختہ پابندیاں پسند نہیں ہیں۔" زرین کے انداز سے بغاوت ظاہر ہو رہی تھی۔

"تم میں حوصلہ ہے ان پابندیوں سے ٹکرانے کا؟" اسریٰ نے یونہی پوچھا تو وہ جواب میں پھٹ پڑی اور ایک لمبی سی تقریر جھاڑ دی۔

حمزہ روز باقاعدگی سے اسریٰ کو فون کرتے تھے چاہے ہاسپٹل آئے یا نہ آئے مگر وہ

روز سے نہ وہ ہاسپٹل آ رہے تھے اور نہ فون کر رہے تھے۔ ان کا موبائل بھی بند تھا۔ رات اس نے تین چار بار حمزہ کو فون کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ زرین خلاف توقع جلدی سو گئی تھی وہ تھکن کے باوجود کافی دیر تک جاگتی رہی۔

چالیسواں ہو چکا تھا۔ رابعہ دکھتے دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔

''اسریٰ جونہی تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہوا۔ میں خاور سے کہہ سن کر پاکستان کا چکر لگانے کی کوشش کروں گی۔ واپس آ کر میں حمزہ بھائی کے گھر والوں سے بات کروں گی۔ اب اس کام میں تاخیر مناسب نہیں۔ جانے کیوں میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا، یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہو جائے گا مگر بڑے ابا نے مجھے بہت تسلی دی ہے۔ وہ تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ اور بڑی امی کو ادھر ہی چھوڑ دیں گے تمہارے پاس۔ مگر اس کے باوجود کوئی بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ اسریٰ! کوئی بھی پریشانی کی بات ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کر لینا۔ بس دو ڈھائی ماہ کی بات ہے۔ یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ اسے کمزور لہجے میں تسلی دے رہی تھی۔

''آپی! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ بالکل پریشان مت ہوں اور یہ رونی صورت بنا کر خاور بھائی کے پاس مت جایئے گا۔ خوامخواہ ڈر جائیں گے۔'' اسریٰ نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی تو رابعہ آنسوؤں کے بیچ مسکرانے لگی۔

''اسریٰ! تم بہت بدل گئی ہو، اچانک ذمہ دار اور بڑی بڑی سے لگنے لگی ہو۔ مضبوط اور باہمت سی ورنہ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی کہ تمہارا کیا بنے گا۔

''بھلا کیا بنتا؟ اب فضول سوچوں میں مت سر کھپایئے۔ جائیں اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر میک اپ کریں۔ سات بجے فلائٹ ہے۔''

اسریٰ نے ماحول خوشگوار کرنے کی جو کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب رہی۔ رابعہ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی تو اسریٰ نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اب لگ رہی ہیں ا میری آپی۔ بجلیاں گرا رہی ہیں۔'' رابعہ جھینپ سے گئی۔ اتنے میں نفیس نے حمزہ اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع دی تو اسریٰ رابعہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''کیسی ہیں آنٹی آپ؟'' اسریٰ، حمزہ کی والدہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بس ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولیں۔ رابعہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں اسریٰ اور حمزہ کی شادی کے بارے میں بات کرنے لگی۔

"میں اسریٰ کے ہاؤس جاب کے بعد آؤں گی، تب تک آپ بھی تیاری مکمل رکھیں۔" اس نے سامنے صوفے پر بیٹھے حمزہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کو محسوس ہوا جیسے وہ مضطرب سے ہو رہے ہیں [illegible] اسریٰ [illegible] گئی۔

"رابعہ! دراصل میں اگلے ماہ انگلینڈ جا رہا ہوں، وہاں سے واپسی پہ سوچوں گا۔" ان کے لہجے میں لاتعلقی تھی۔

"آپ کب تک آ جائیں گے؟"

"پتا نہیں۔" انہوں نے کمال بے نیازی سے کہا تھا۔ رابعہ کو ان کا یہ انداز بہت برا لگا۔ حمزہ کی والدہ اس دوران بالکل خاموش رہیں جیسے اس قصے میں ان کا کوئی [illegible] ہی نہیں ہے۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔

شہباز گیلانی، سلطانہ خاتون اور زرین کے ساتھ آ گئے تھے۔ جانے سے پہلے رابعہ نے ایک بار پھر بڑے ابا سے اسریٰ کا خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔

❁

بڑے بے رنگ سے شب و روز تھے اگر ہاسپٹل کی مصروفیت نہ ہوتی تو اسریٰ شاید تنہائی سے گھبرا کر کچھ کر بیٹھتی۔ سلطانہ خاتون یعنی بڑی امی بھی اس کے پاس تھیں مگر کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا وہ ان کی کڑی نگرانی میں ہے۔

خدا خدا کر کے اس کا ہاؤس جاب مکمل ہوا۔ حمزہ اس سے پہلے ہی انگلینڈ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جانے سے پہلے وہ رسماً اسریٰ سے ملے تھے۔ مگر ایک جملہ بھی انہوں نے تسلی کا نہیں کہا تھا۔

ایک شام وہ واپس آئی تو سلطانہ خاتون اپنا سامان رکھوا رہی تھیں۔

"بڑی امی! کہاں کی تیاری ہے؟"

"واپس جا رہی ہوں۔ تم بھی تیاری کر لو، سہراب کی شادی ہے۔ 22 فروری تاریخ رکھی ہے، [illegible] ہفتہ دس دن تو تمہیں وہاں لگ ہی جائیں گے۔ تم بھی [illegible] سہراب کی خوب خوشیاں منانا سب کے ساتھ۔ ذرا حویلی میں جا کر دیکھنا تو سہی، کیسی رونق اور ہنگامہ لگا ہوگا۔ سب

بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم ہاشم کی بیٹی ہو ہمارا خون۔ شہباز کئی بار تمہارے لیے روئے ہیں۔ اس خالی ڈھنڈار گھر میں کب تک رہو گی۔ گاؤں آؤ۔ دیکھنا تمہیں کتنی اپنائیت اور محبت ملے گی۔" وہ ساتھ ساتھ اسریٰ کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے بڑی امی! لائف میں تھوڑی تبدیلی تو آنا ہی چاہیے میں خود بور ہو رہی تھی جب تک کہیں جاب ملتی ہے تب تک تھوڑا انجوائے منٹ ہی سہی۔" اس کے اتنے جلدی مان جانے پہ سلطانہ خاتون مطمئن ہو گئی۔

اسی روز شام کو وہ گاؤں کے لیے روانہ ہوئے راستے میں شہباز اسے گاؤں کے بارے میں بتاتے رہے۔

"یہ دس کلومیٹر لمبی سڑک ہم نے حویلی والوں کی آمد و رفت کے لیے بنوائی ہے۔ اس پہ کسی اور کی گاڑی ہماری اجازت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہ دائیں اور بائیں کھیت سینکڑوں ایکڑ پہ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہمارے اپنے ہیں اور یہ رہی ہماری حویلی اس کے گیٹ کے ساتھ ہی دیوار پہ دو مچان ہیں۔ یہاں چوبیس گھنٹے دو باوردی محافظ آتشیں اسلحے سمیت پہرا دیتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں آئے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہیں نکل سکتا اور جو کوئی ہماری اجازت کے بغیر یہ جرأت کرے وہ پھر اپنی ٹانگوں پر چل کر گیٹ سے باہر نہیں جا سکتا۔"

بڑے ابا کا لہجہ سرسری سا مگر الفاظ بہت سرد اور سفاک تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع یقیناً گیٹ سے اندر پہنچ گئی تھی۔ سب ایک جلوس کی شکل میں فرداً فرداً شہباز گیلانی کو سلام کر رہے تھے۔ اسریٰ سے وہ سب سرسری سا ملے بڑے ابا اور سلطانہ خاتون کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا جا رہا تھا۔ یہاں آتے ہی اس کے نازک سے دل پہ یہ پہلی چوٹ پڑی تھی۔ ہاں چھوٹے چچا سکندر گیلانی اور ان کی بیٹی پروین بڑی محبت اور اپنائیت سے اس سے ملے تو اس کی طبیعت پہ چھایا تکدر کسی حد تک کم ہو گیا۔

"سنا ہے تمہارے بھائی دراب کی شادی ہو رہی ہے۔ کس سے ہو رہی ہے؟ اور حویلی میں تو شادی کی کوئی گہما گہمی ہی نہیں ہے۔ بڑی امی تو کہہ رہی تھیں کہ......"

پارو ماتھے پہ ہاتھ مار کر مسکرا دی۔

"دراب بھائی کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی ہے شادی اتنی جلدی کیسے ہو گی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اسریٰ آپی۔" وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پارو اس سے پانچ چھ سال

چھوٹی تھی۔طبعاً بہت سادہ اور سچ بولنے والی اسریٰ کا جی گھبرانے لگا۔

رات کھانے کے لیے اسے ملازمہ بلانے آئی تو وہ مرے مرے قدموں سے ڈائننگ ہال تک پہنچی۔

وہ پہلے بھی حویلی آ چکی تھی مگر اس وقت اس نے مکینوں کے رویے کو جانچنے سے احتراز برتا تھا۔دوسرے باپ کی موت کا زخم تازہ تھا کسی دوسری طرف اس کی نگاہ گئی ہی نہیں۔مگر آج کافی باتیں واضح ہونے لگی تھیں۔بڑے ابا سمیت باقی سب کا لیا دیا انداز لڑکیوں کی ہچکچاہٹ، پارو کی خوش خلاقی، سلطانہ خاتون کی کڑی نگاہ۔ان سب کے پس پردہ جانے کون سے عوامل کارفرما تھے۔

”کیا ہے، میں فوراً واپس جاؤں گی اس اجنبیت بھرے ماحول میں، میں مزید نہیں رہ سکتی۔ابھی بڑے ابا سے کہتی ہوں مجھے واپس بھجوا دیں۔“اس نے اپنی سوچ پہ فوراً عمل درآمد بھی کر ڈالا۔بڑے ابا نشست گاہ میں سلطانہ خاتون کے ساتھ بیٹھے تھے۔اسریٰ کی بات پہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اب تم واپس نہیں جاؤ گی کم از کم اس وقت تک جب تک میرے مطالبات تمہیں مان لیتیں تم۔اس حویلی سے باہر کی زندگی تمہارے لیے خواب ہے، صرف خواب۔میں نے اب تک تم سے بہت نرمی کا سلوک کیا ہے صرف مجبوری کی وجہ سے۔یہ اب تم پہ منحصر ہے کہ تم اپنے ساتھ کسی قسم کا سلوک پسند کرتی ہو۔آج سے خود کو اپنے کمرے تک محدود سمجھنا۔میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔میری کوشش تو یہی تھی کہ اس کی نوبت نہ آئے مگر تم تو بہت جلد گھبرا گئی ہو۔“

آج ان کے چہرے سے خوش اخلاقی کا مصنوعی نقاب مکمل طور پر اتر چکا تھا۔

اسریٰ کو چھٹی حس جس خطرے کی آمد کا اعلان کر رہی تھی وہ سامنے آ گیا تھا۔

”سلطانہ! جاؤ اسے کمرے میں پہنچا آؤ۔“

”بڑے ابا یہ سب کیا ہے آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔میں عاقل و بالغ لڑکی ہوں جب تک آپ اس رویے کا سبب نہیں بتائیں گے میں آپ کی کوئی بات بھی نہیں مانوں گی۔“

”کیا کہا۔نہیں مانو گی؟ شہباز گیلانی کی کبھی کسی نے حکم عدولی نہیں کی ہے، میری لغت میں ناں کا لفظ نہیں ہے۔اب کی بار میں شکست قبول نہیں کروں گا۔“

شہباز گیلانی اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے پر غضب انداز میں گھور رہے تھے۔

پہلی بار سچ مچ پہلی بار اسرٰی کو بڑے ابا سے انتہائی خوف محسوس ہوا، وہ اس کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"جاؤ اپنے کمرے میں، ٹھنڈے دل سے ہر چیز کے بارے میں غور کرو۔"

"بڑے ابا کس چیز کے بارے میں غور کروں۔" اس نے کچھ سوچ کر نرمی سے پوچھا۔

"ہاں۔ اب کچھ معقول بات کی ہے تم نے، اصل میں، میں نے ملک انور کے بیٹے کا رشتہ تمہارے لیے منظور کر لیا ہے۔" انہوں نے بالکل عام سے انداز میں بات کی۔ حیرانی در حیرانی، تعجب در تعجب انکشافات، وہ ششدر رہ گئی۔

"بڑے ابا ابو نے اپنی زندگی میں ہی میرا رشتہ ڈاکٹر حمزہ سے طے کر دیا تھا۔ آپ کو تو سب کچھ پتہ ہے۔" وہ بمشکل بولی تھی۔

"وہ رشتہ ہاشم نے طے کیا تھا اور یہ میں کہہ رہا ہوں تمہیں۔ تم آئندہ میرے سامنے اس کا ذکر مت کرنا اگر حمزہ سے تمہارا رشتہ طے تھا تو وہ انگلینڈ جا کر کیوں بیٹھ گیا ہے۔ ہونہہ بزدل۔ گیدڑ کی اولاد۔ وہ آئندہ اپنی شکل بھی تمہیں نہیں دکھائے گا۔ اس کا خیال دل سے نکال دو۔"

اسرٰی نے خود کو بے حد بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس طویل و عریض کمرے کی ہر شاہانہ چیز جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ شہباز گیلانی نے اس کا موبائل فون بھی اس سے لے لیا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ کاش وہ کسی طرح جواد انکل اور رابعہ آپی سے رابطہ کر سکتی۔ اس کی یہ خواہش حیرت انگیز طور پہ پوری ہو گئی۔ رات وہ بستر پہ لیٹی اس الجھی ہوئی صورت حال پہ غور کر رہی تھی تو شہباز گیلانی دبے قدموں سے اس کے کمرے میں آئے وہ انہیں دیکھ کر خود چونکی اور دوپٹہ درست کرتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ان کے ہاتھ میں اسرٰی کا موبائل فون تھا۔

"یہ لو فون، جواد لطیف کا نمبر ملا کر کہو کہ تم گاؤں میں ہو اور فی الحال تم نے فیصلہ کیا ہے کہ ادھر ہی رہو گی۔ یہی بات تم رابعہ سے بھی کہو۔ امید ہے میری بات پہ عمل کرو گی اگر نہ کیا تو اپنا ہی نقصان ہے تمہارا۔ یہ مت سمجھنا کہ کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ میں اس کا حشر خراب کر دوں گا۔" انہوں نے وارننگ دے کر فون اسے تھمایا۔

پھر انہوں نے جیسا کہا ویسا ہی کیا۔ "خاصی سمجھداری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔" نہ جانے انہوں نے اسے سراہا تھا یا طنز کیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"میرے خدا! میں کیا کروں۔" اس نے سر کے بال بے دردی سے مٹھی میں جکڑے۔ چند گھنٹے میں اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ایک خود مختار پر اعتماد لڑکی کے بجائے وہ قیدی بن گئی تھی اور قیدی بھی بڑے ابا جیسے دوچہرے رکھنے والے دشمن کی۔

اسے سارے ددھیال کی بے حسی پہ حیرت ہو رہی تھی۔ بڑے ابا کے سوا کسی نے اس کے کمرے میں آ کر جھانکا تک نہ تھا۔ گویا وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو، بے جان چیز ہو۔ ان کے سامنے ہی تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ گویا سب کی مرضی سے یہ کام ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سفیان کرسی ڈالے بندوق تھام کر یوں بیٹھا تھا جیسے اندر کوئی خطرناک مجرم بند ہو۔ شہباز نے سلطانہ خاتون کے سوا ہر کسی کا داخلہ حویلی کے اس حصے میں ممنوع قرار دیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کی پریشان سوچیں۔

باہر سناٹا گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اسریٰ رونا نہیں چاہتی تھی۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ اس وقت اسے ہاشم صاحب بری طرح یاد آنے لگے۔ ٹھنڈی گھنی بیٹھی چھاؤں جیسے ہاشم گیلانی جو اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

کافی دیر وہ دل گرفتہ سی نڈھال بیٹھی رہی بالآخر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

صبح نوجوان ملازمہ ناشتہ لے کر آئی۔ اسریٰ نے ٹرے ایک طرف سرکا دی۔ شی ابھی تک اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کان دروازے کی طرف لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر اسریٰ کے پاس آ گئی اور انتہائی مدھم آواز میں بولی۔

"اسریٰ بی بی! زرین بی بی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ابا کی بات نہیں مانتی ہے اگر آپ نے ان کی نکاح والی تجویز مان لی تو ساری زندگی ذلت کی چکی میں پستے ہوئے گزاریں گی۔"

جس طرح آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے چلی گئی۔

اسریٰ نے سامنے پڑا ناشتہ دیکھا۔ اسے بالکل بھی بھوک نہیں تھی۔ مگر دل کو تھوڑی ڈھارس ہو گئی تھی کہ کوئی تو اس کا ہمدرد ہے۔ دوپہر کو شی اس کے لیے کھانا لائی تو اس نے آہستہ اور محتاط آواز میں اس سے کہا۔

"تم زرین بی بی سے کہو۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

شی نے نفی میں سر ہلایا اور نظریں جھکائے بولی۔

"جب تک آپ کا نکاح نہیں ہو جاتا یہ پابندی برقرار رہے گی۔" وہ شکوہ کناں نگاہوں سے شمی کو دیکھ کر رہ گئی۔

اس قید سے نکلنے کے لیے کیا وہ بڑے ابا کے ساتھ سودے بازی کرلے یا پھر زرین کی بات مان کر انکار کر کے ہمیشہ کے لیے یہ اندھیرے اور قید خرید لے۔

میرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے پھر میں کس برتے پہ لڑوں۔ زرین بھی تو میری طرح کمزور سی لڑکی ہے۔ بھلا وہ میری کیا مدد کر سکتی ہے۔" بڑے ابا صرف اور صرف اس شادی پہ مجبور کرنے کے لیے تو یقیناً اسے یہاں نہیں لائے ہوں گے۔ اس کے پیچھے یقیناً کوئی مقصد ہوگا پھر حمزہ کا آخری ملاقات میں سرد اور روکھا سا رویہ، بڑے ابا کا حقارت سے اس کا ذکر کرنا۔ یقیناً حمزہ کے اس رکھے رویے کے پس پردہ بڑے ابا کا ہاتھ ہوگا۔ حمزہ کی یاد آتے ہی اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ڈاکٹر حمزہ بارش خوشبو اور چاند کی باتیں کرنے والے۔ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ پہ اسے یک ٹک دیکھنے لگتے، جنھوں نے امرتی کی سالگرہ پہ اسے اس کے پسندیدہ شاعری کی کتابوں کا سیٹ گفٹ دیا تھا۔ جانے کیوں وہ انگلینڈ چلے گئے تھے۔

بھلا کیا تھا امرتی کے پاس، چند یادوں، کچھ مسکراہٹوں اور ایک ادھورے لمس کے سوا۔ وہ حمزہ کے تصورات کے ساتھ بہت دور تک تو نہیں گئی تھی مگر وہ اس کی زندگی میں آئے تو تھے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی وہ حقیقت تھے مگر اب خواب بنتے جا رہے تھے موہوم اور دھندلا سا خواب جو آنکھ کھلنے پہ یاد ہی نہیں رہتا۔

کتنے کمزور نکلے تھے وہ بڑے بڑے دعوے کرنے والے وہ کس کس کا افسوس کرتی فی الحال تو موجودہ حالات ہی اس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

دوپہر کا کھانا بھی یونہی رکھا رہا۔ رات میں اس نے صرف دو نوالے کھائے۔ نقاہت کے سبب اس کا ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

اگلی صبح شمی ناشتہ لے کر آئی تو امرتی کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ کب تک نہیں کھائیں گی، کھائیں خوب ڈٹ کر کھائیں۔ زرین بی بی نے کہا ہے آپ مایوس مت ہوں وہ جلدی ہی کوئی راستہ نکال لیں گی۔" وہ انتہائی آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔

"سچ!" امرتی جیسے مرتے مرتے جی اٹھی۔ شمی نے تسلی دینے والے انداز میں اثبات

کا ہاتھ دبایا۔

اس نے بڑی رغبت سے ناشتہ کیا پیٹ میں غذا اتری تو ذہن بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ تین روز سے اس کے جسم پہ وہی پرانا لباس تھا۔ الجھے بال جو بے ترتیبی سے اس کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔ بے رونق چہرا، زرد رنگت، آنکھوں کے گرد حلقے۔ صرف تین دن کے اندر اسکی یہ حالت ہوگئی تھی۔ بے رونق سی ہنسی اس کے لبوں پہ آکے دم توڑ گئی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے از سر نو اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ کنگھی کی اور ساتھ لائے کپڑوں میں سے ایک سوٹ نکال کر پہنا۔ اس کے بعد کارپٹ پہ ہی بیٹھ کر دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔ "اے اللہ میرے لیے جو بہتر ہو وہی کرنا۔"

ایک نئی توانائی جیسے اس کے جسم و جاں میں اچانک لہو کے ساتھ شامل ہو کر دوڑنے لگی تھی۔ شمی چائے لے کر آئی تو اس نے بڑے ابا سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

پانچ منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھے۔

"بڑے ابا! مجھے آپ کے مطالبے منظور ہیں بس یہ خیال رہے کہ رابعہ آپی خوش رہیں۔" اس کا لہجہ بہت باوقار تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے پتہ تھا تم نادانی سے کام نہیں لوگی۔" اچانک ان کا لہجہ بدل گیا پہلے کی طرح وہی محبت لٹاتا لہجہ اور الفاظ۔ مگر اسری ہر جذبے سے عاری ہو کر آئندہ ہونے والے سودوزیاں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

سفیان بدستور اس کے کمرے کے دروازے پہ متعین تھا۔

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ حویلی میں رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ سفید حویلی چمکتے انوار ملک، واجد اور ملک امجد کے ساتھ ان کی بیویاں ملک واجد کی دونوں بیٹیاں اور اماں بی بھی بے حد فخر اور خوشی سے شہباز گیلانی کے پاس آئے دولہا فخر اور دوسرے دو کزنز کے ساتھ بعد میں آیا۔

اسی کا انتظار تھا نکاح خواں اور مسجد کے پیش امام صاحب کے ساتھ دوسرے سب مہمان دولہا کی راہ تک رہے تھے۔

"مبارک ہو" فخر نے سب سے پہلے گلے ملتے ہوئے اسے نکاح کی مبارک باد دی اور بڑا سا لڈو بھیا کھلا کر ہی چھوڑا۔

اندر اسریٰ کی پاس دانیہ اور ثانیہ تھیں جو ایک ایک زاویے سے اسریٰ کا شکست خوردہ سراپا کیمرے میں تصویروں کی صورت مقید کر رہی تھیں۔

ان کے خاندان میں لڑکی کی رخصتی سے پہلے اسے دلہن جانے کا رواج نہیں تھا سو اس کا نکاح بھی بغیر کسی تیاری اور میک اپ کے ہی ہوا۔ سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے اسریٰ میکانکی انداز میں تصویریں بنوا رہی تھی۔

''یار تم نے تو یہ میدان مار ہی لیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔'' نکاح کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات کا سلسلہ جاری تھا۔ جب فخر رشک بھرے انداز میں بولا۔ زیاد مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتح مندی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میں کبھی نہیں ہارا، اب تو تمہیں بھی یقین آ جانا چاہیے۔ ویسے راز کی بات بتاؤں، میرے دل کو بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ میری ہم سفر بن گئی ہے۔ اس کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ میرے لیے یہ خواب ہی بڑا دلکش ہے۔'' اس کی آنکھوں سے سرمستی کی کیفیت عیاں تھی۔

''اوہ یار! میرے ساتھ ہی کہیں رومینٹک ڈائیلاگ بولنا نہ شروع کر دینا۔'' فخر نے اسے چھیڑا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

''ویسے تمہارے لیے ایک ڈاکٹر کی یوں بھی اشد ضرورت تھی۔ آئے دن ٹوٹتے پھوٹتے جو رہتے ہو۔ تھوڑا فائدہ ہو جائے گا۔''

زیاد اسے مکا رسید کرتے کرتے رہ گیا۔

اسریٰ کی تمام تصویریں اس کے سامنے بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک ایک تصویر کو کئی کئی بار دیکھ چکی تھا مگر طبیعت سیر ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی
ڈاکٹر صاحب تم جلدی سے خود ہی چلی آؤ

وہ اتنا مگن تھا کہ فخر کے آنے کی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ایک مشہور پرانے گانے کی اس نے بیدردی سے ٹانگ توڑی تو زیاد ہڑبڑا گیا۔

''تم کیوں بے وقت نازل ہو گئے ہو۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کافی دیر سے جناب کا استغراق ملاحظہ کر رہا ہوں۔ یار! ابھی سے تمہارا یہ حال

ہے۔ آئندہ جانے کیا ہو گا۔"

"فخر! تم نے کسی سے محبت کی ہوتو تمھیں پتہ ہو نا! اس محاذ کو سر کرنے میں مجھ لوگ میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ میں پہلی نگاہ کی محبت پہ ذرا بھی یقین نہیں رکھتا تھا مگر اسریٰ کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین کرنا پڑا کہ محبت یوں بھی ہو جاتی ہے۔ اب میرے خواب کی حسین تعبیر مجھے ملنے والی ہے تو دل چاہتا ہے سب کو اس خوشی میں شریک کروں۔" وہ جذباتی ہو گیا تو فخر نے اس کی خوشیوں کے دائمی رہنے کی دعا کی۔

علیزہ بھابھی فخر کو آواز دے رہی تھیں وہ تصویریں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

زیاد نے تمام تصویریں سمیٹ کر دراز میں ڈال دیں اور آنکھوں پہ بازو رکھ کر دراز ہو گیا۔ کمرے میں رکھا ٹیپ دھیمی آواز میں چل رہا تھا۔

چوری چوری آئے کوئی
دل میں سمائے کوئی
کبھی روٹھ جائے کبھی مان جائے
سمٹے ہوئے آنچل کو کیسے اٹھائے کوئی

"زیاد نے ہاتھ بڑھا کر والیوم بلند کر دیا۔"

دیکھوں میں تو شرمائے
نظریں چرائے کوئی

نہ جانے اسے دیکھ کر وہ کس ردعمل کا اظہار کرے گی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی ہو گی کہ ہاسپٹل میں روم نمبر بائیس کا مریض جس کا وہ نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا زندگی بھر کا ناتا جڑا ہے۔

آج وہ مایوں بیٹھی تھی۔

پرسوں رخصتی تھی۔

زرین نے ساری لڑکیوں کو اس کے کمرے سے نکال دیا۔

"اب آرام کرنے دو اسریٰ کو۔ خوامخواہ کھپ ڈالی ہوئی۔" اس کا لہجہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی دیر وہ روتی رہی ہو۔ سرخ آنکھیں بھی اس کی غماز تھیں۔

اسریٰ نے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھا کر زرین اور پھر خالی کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ آ کر

بیڈ پہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسریٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جو بے جان سا محسوس ہو رہا تھا، خود زرین کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

"اسریٰ! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ابو کی کسی بات پہ بھی سر نہ جھکانا۔"

"تو میں کیا کرتی۔ ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتی۔ میں نے اپنی بہتری کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے شاید اسی میں اوپر والے کی کوئی مصلحت ہو۔"

"تم بہتری کی طرف نہیں تباہی کی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔ تم جسے مصلحت کا نام دے رہی ہو وہی تمہاری بربادی کا نقطہ آغاز ہے۔ اسریٰ! کاش تم میری بات مان لیتیں تو میں کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی۔ تمہیں کچھ بھی تو نہیں پتہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اسریٰ! ابو جان نے تمہیں ذلت کی عمیق گہرائیوں میں شادی کے نام پہ پھینک دیا ہے.... "ابو جان نے تمہیں بطور تاوان سفید حویلی والوں کی قید میں دے دیا ہے۔ یہ صرف نکاح کے نام پہ اور اس نکاح میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ جعلی نکاح ہے یہ۔ ابو جان نے تمہاری شکل میں اپنی ایک دیرینہ برسوں پرانی دبی آرزو کی ناکامی کا انتقام لیا ہے۔"

اسریٰ سسکیاں بھرتی اس سے لپٹ گئی۔

"اسریٰ! تم یہاں سے نکل کر اب عملاً سفید حویلی والوں کی دائمی قید میں رہو گی۔ اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ یہاں سے۔" زرین اس سے الگ ہو کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

اسریٰ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پورا جسم خوف کی زیادتی سے تنا ہوا تھا۔

"زرین! یہ سب کیا ہے۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ یوں لگ رہا ہے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

"اسریٰ! وقت بہت کم ہے مگر پھر بھی میں اپنی سی کوشش کروں گی میں تمہیں بچانے کے لیے پوری کوشش کروں گی چاہے اس کے لیے مجھے خود نقصان اٹھانا پڑے۔"

"تم کیا کر سکتی ہو میرے لیے۔"

"وقت آنے پر جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"تم اپنے ابو جان کے بجائے میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟"

"اس لیے کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے اور میرے ساتھ بھی۔ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ ماروں یا مر جاؤں کیونکہ میں بھی شہباز گیلانی کی بیٹی ہوں۔" زرین کے اعصاب بے حد

منتشر ہو رہے تھے۔

"اسریٰ! تمہیں تھوڑی سی بہادری دکھانا ہوگی۔ تھوڑی سی ہمت پھر تم اس زنداں سے باہر ہوگی۔ پلیز اسریٰ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وقت تیزی سے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔"

"میں کیا کروں زرین! تم ہی بتاؤ میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی ہے۔"

"میں ہوں نا تمہاری ساتھ۔ سب کچھ سمجھا دوں گی مگر پہلے ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتی ہو اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو پھر ایک شاندار آئیڈیل زندگی تمہاری منتظر ہے۔ ہر قسم کے خدشوں سے پاک۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جاؤ۔"

اسریٰ ساکت وصامت اسے دیکھتی رہ گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"سب کچھ ممکن ہے اگر تھوڑی سے عقل ہو تو۔"

"مگر میرا نکاح ہو چکا ہے۔"

"تم اس جعلی ڈرامے کو نکاح کہہ رہی ہو؟ یہ بات تو تم بھی جانتی ہو کہ دونوں فریقین کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اسریٰ! تم نے مجبوری میں نکاح کو قبول کیا ہے۔ دل سے راضی نہیں ہو تم، ابو جان سے خوفزدہ ہو کر تم نے ان کی بات مانی ہے تم اسے عدالت میں چیلنج کر سکتی ہو یقیناً فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا۔"

زرین اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی جس پہ امید وبیم اور تذبذب کے اثرات محسوس کیے جا سکتے تھے۔

"زرین! تم تو خوابوں کو حقیقت بنانے کی بات کر رہی ہو۔"

ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے گلابی لبوں پر ٹھہر گئی۔

"میں اتنی دیر سے تمہیں یہی تو سمجھا رہی ہوں کہ خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری لڑکی ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ شہری لڑکیاں بہت بولڈ اور حوصلہ مند ہوتی ہیں۔"

زرین چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تو اسریٰ اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گئی۔

زرین اس کے قریب آ گئی۔

"میں اپنی جان پہ کھیل کر تمہیں حویلی سے باہر پہنچا سکتی ہوں۔"

"کیسے؟"

"یہ مجھ پہ چھوڑ دو۔"

"مگر زرین! کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہوگا"۔

"محبت اور جنگ میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔" اسریٰ اتنی پریشان تھی کہ زرین کا جملہ اس کی سماعتوں سے دور ہی رہا۔

"بڑے ابا کو اگر پتا چل گیا تو؟ وہ پہلے ہی اتنے عجیب طریقے سے ری ایکٹ کر رہے ہیں۔" اس کے اندر کا خوف لبوں پہ آ گیا۔

"انھیں پتہ نہیں چلے گا۔"

"اور گیٹ پہ موجود گارڈز ہیں؟"

"میں نے کہا نا۔ تم فکر مت کرو۔ بس یہ تصور کر کے انجوائے کرو کہ تم ان بے مہر سنگ دل لوگوں کے گھیرے سے باہر ہوگی۔ ٹھیک اسی وقت کل۔"

"مگر زرین! کیا یہ ٹھیک ہے؟" اسریٰ بے حد تذبذب کا شکار تھی۔

"تمہارے ساتھ کسی نے ٹھیک کیا ہے؟ ابو جان تمہیں دھوکے سے یہاں لائے اور تم پہ باہر کی دنیا کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ سنو حقیقت کیا ہے؟ سفید حویلی والوں سے ہماری برسوں سے دشمنی ہے ایک سال پہلے بابر بھائی کی لڑائی سفید حویلی والوں کے منہ چڑھے ملازم سے ہوگئی۔ بابر بھائی نے اسے اس بری طرح سے مارا کہ اس کے دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ حویلی والوں نے اس کے علاج پہ پانی کی طرح روپیہ خرچ کیا مگر ڈاکٹرز کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ تین ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹرز نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اکبر کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ عضو معطل کی طرح گھر میں پڑا ہوا ہے۔ نہ کسی کو پہچانتا ہے، نہ بول سکتا ہے۔ اس کی بیوی کی حالت دیکھی نہیں جاتی ہے۔ سفید حویلی والوں نے ابو جان سے اس کا تاوان طلب کیا یا تو وہ بابر بھائی کو ان کے حوالے کر دیں یا پھر اپنی کوئی عورت دے کر جان بچائیں۔ ابو نے کہا وہ ایک نہیں دو لڑکیاں دیں گے۔ جانتی ہو وہ دو لڑکیاں کون تھیں؟"

"تمہیں۔" اسریٰ دم بخود ایک ایک لفظ میں کھوئی ہوئی تھی۔

''وہ دو لڑکیاں تم اور تمہاری بہن رابعہ تھیں۔ رابعہ تو بس تمہیں بچا کر ابو جان نے تمہیں اپنا محکوم بنا لیا۔ امرئی! اس تعلیم یافتہ دور میں تمہاری قسمت کا فیصلہ بھیڑ بکریوں کی طرح کیا گیا۔ مردوں کی اس جنگ میں ہم عورتوں کو لوٹ کا مال کیوں سمجھا جاتا ہے۔ امرئی! تمہاری شخصیت کو، ساری زندگی کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے رابعہ کی شادی کے روز جب ہاشم چچا کو ہارٹ اٹیک ہوا تو اس کا سبب کون تھا؟ میرے والد محترم۔ امرئی! وہ چچا کو موت کے دہانے پہ پھینک آئے۔ ان کا ہتک والا رویہ ہاشم چچا کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور تم پھر بھی خاموش ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو جانے کیا کچھ کر ڈالتی۔ ستم ظریفی تو دیکھو، تمہیں، ایک جیتی جاگتی لڑکی کو سفید حویلی والے وحشیوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ہم سے اچھے تو وہ ہیں جنہیں اپنے معمولی سے ملازم کا اتنا خیال ہے۔ تم تو اس کی کمین سے بھی گئی گزری ہو بظاہر تو تم ملک انور کے بیٹے کی بیوی بن کر جا رہی ہو مگر عملاً تمہیں اکبر کی چاکری، خدمت گزاری اور تیمارداری کرنی پڑے گی کیا خبر جلد یا بدیر وہ جب تندرست ہو جائے تو اس کی بیوی کا کردار بھی ادا کرنا پڑے۔''

''پلیز زرین! مزید ایک لفظ مت کہنا۔ میں جان تو دے سکتی ہوں مگر مگر.....'' اس سے آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ حلق میں غم و غصے کی زیادتی نے جیسے پھندا لگا دیا تھا۔

''تم جان مت دو، یہاں سے نکلنے کی فکر کرو پھر تم سب کچھ کر سکو گی۔'' زرین نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''کل رات تک سب انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہارے گھر سے تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر چیزیں منگوائی ہیں ان کی تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں جا رہی ہوں اب تم سو جاؤ۔'' زرین اس کے ماتھے پہ پیار کر کے چلی گئی۔

حرف تازہ نئی خوشبو کا لکھا چاہتا ہے
باب اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے
ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اس کی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے
اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے

ریت سی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے

اور صحرا تیرا نقش کف پا چاہتا ہے

فارم ہاؤس بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے بھیگتی رات حمیرا عرف گگی کی سریلی پرسوز آواز کے ساتھ بڑی رسیلی اور البیلی سی لگ رہی تھی۔ زیاد اور اس کے دوست، رشتہ دار مہمان حضرات اور دوسرے تمام مردوں کے لیے یہاں فارم ہاؤس میں اپنے انداز میں خوشی منانے کے لیے ملک انوار نے بڑے زبردست انتظامات کیے تھے۔ وسیع قطعہ زمین پہ فرشی دریاں بچھا کران پہ گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ سامنے قدرے بلند جگہ پہ اسٹیج بنا ہوا تھا جہاں اس وقت گگی سازندوں کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ آئی نیلم اور پکھراج تھک ہار کر بیٹھی گئی تھیں۔

زیاد فخر اور ارمان کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ من چلے بے قابو ہو کر نیلم اور پکھراج کے ساتھ زبانی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

"تم کیا زاہد خشک بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ شادی سے پہلے ایسے تجربات ضرور کرنے چاہئیں بیوی رعب میں رہتی ہے۔" زیاد کے چچازاد کاشف نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جو اس نے نرمی سے چھڑا لیا۔

"پلیز یار! مجھے معاف ہی رکھو۔"

زیاد بدمزا سا ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کے پیچھے کچھ شریر قہقہے گونجے تھے۔

سگریٹ سلگا کر وہ لمبے لمبے کش لیتا اسریٰ کے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسریٰ جو اس کی زندگی میں باضابطہ طور پر شامل ہو گئی تھی۔

زیاد نے جب اسے پہلی بار ہاسپٹل میں دیکھا تھا تو اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ شہباز گیلانی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے خاندان میں لڑکیاں نہیں تھیں یا پھر اسریٰ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔

زیاد کو اس کا انداز مسیحائی اور پر اعتماد رویہ بہت اچھا لگا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو جائے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے چلتے پھرتے اس کے خواب دیکھتا۔ بن کہے بن مانگے اس کی آرزو کی تکمیل ہو گئی تھی۔

شہباز گیلانی کے اکلوتے بیٹے بابر نے اس کے چہیتے ملازم اکرم کو شدید زخمی کر دیا تھا

پھر جرگہ بیٹھا جس میں فیصلہ ہوا یا تو پاریگو ان کے حوالے کیا جائے یا پھر شہباز کی بیٹی کو سفید حویلی والوں کو بہو بنایا جائے۔ شہباز کے لیے دونوں فیصلے ناقابل قبول تھے مگر جرگے کے فیصلے سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

اسی دوران دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زیاد نے اسریٰ کے بارے میں تمام معلومات حاصل کروائیں تو ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اس کا سارا خاندان دل سے اس دشمنی کا خاتمہ چاہتا تھا جو سالہا سال سے چلی آ رہی تھی اس لیے انہوں نے حویلی والوں کی بیٹی سے نکاح کی شرط رکھی تھی۔ کیونکہ اپنی بیٹی ملکوں کو بیاہنے کے بعد لازمی طور پہ انہیں اپنے معاہدے کی پاس داری کرنی پڑتی شاید اس طرح بیچ بچ وہ نرم پڑ جاتے کیونکہ ان کی بیٹی ملکوں کی بہو ہوتی۔ وہ ملکوں کا نہ سہی اپنی بیٹی کا تو ضرور خیال کرتے۔ اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین رسہ کشی کا خاتمہ ہو جاتا ایک امن و محبت کی فضا بن جاتی۔ اس طرح ان کے گاؤں کی قسمت ہی بدل جاتی کیونکہ وہاں کے باسی بھی قدرتی طور پہ حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک حصہ ملکوں کی حمایت پہ کمربستہ تھا تو دوسرا گیلانیوں کی سائیڈ لیتا۔

شہباز گیلانی کے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ لاڈلی زرین دشمن کے گھر جائے اس طرح تو ان کی طاقت ہی صفر ہو جاتی۔ پاہر روپوش تھا۔ ادھر جرگے والوں کا اصرار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں سامنے کی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ہاشم کی بیٹیاں کس مرض کی دوا تھیں۔

"کون سا ہاشم میرے برابر کا ہے۔ کون سا رابعہ اور اسریٰ ہمارا خون ہیں۔ وہ صرف ہاشم کا خون ہیں۔ اس ہاشم کا جس سے میں بے حد نفرت کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شہباز غالباً یہ بات فراموش کر گئے تھے کہ رابعہ اور اسریٰ ان کی پھوپھی زاد وزری کی اولاد بھی ہیں۔

تین سال پہلے شہباز نے ہاشم کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ یوں آنا جانا شروع ہو گیا بلکہ جانے کی بات غلط تھی کیونکہ شہباز ہی ہاشم کے پاس خود آتے تھے وہ کبھی کبھار ہی گاؤں جاتے۔ شہباز اب یکسر بدلے ہوئے تھے آہستہ آہستہ انہوں نے ہاشم کا اعتماد حاصل کر لیا۔ رابعہ کی بات طے کر دینے پہ انہوں نے بہت شور مچایا ہاشم کو طرح طرح کے لالچ دیے۔

رابعہ کے سلسلے میں ان کو بات بنتی نظر نہیں آ رہی تھی حالانکہ اس سلسلے میں انھوں نے ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا تھا مگر شاید کاتب تقدیر کو ان کے مذموم ارادے اچھے نہیں لگے وہ چاہتے تھے کہ اپنے والدین کے سامنے سفید حویلی والوں کی بہو کے طور پہ رابعہ اور اسری کا نام پیش کریں۔ اس بارے میں انھوں نے ملک انوار کو ہموار کرنا شروع کر دیا۔

شہباز گیلانی نے ملک انوار کو لکھ کر دیا کہ وہ ہاشم گیلانی کی بیٹی ڈاکٹر اسری کا رشتہ بڑی خوشی سے انھیں دے رہے ہیں۔ اس روز سفید حویلی میں جشن کا سماں تھا کیونکہ شہباز گیلانی نے بیٹی دے کر شکست قبول کر لی تھی۔ زیاد کو بھی پتا چل چکا تھا کہ جس لڑکی کو جرگے والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے، وہ ڈاکٹر اسری ہے اس نے ملک انوار کو قائل کر دیا کہ وہ جس لڑکی کے لیے چھ ماہ سے خوار ہو رہا ہے، وہ یہی لڑکی ہے۔

"ہم اسے اپنی بیٹی اپنی عزت بنا کر لائیں گے کیونکہ وہ ہمارے زیاد کی محبت ہے اور محبت قدموں میں نہیں دل میں بسا کر رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ہم سچ سچ صدق دل سے اپنی دشمنی کا یہیں پہ خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو چیز زیاد کو پیاری ہے وہ ہمیں بھی پسند ہے۔ ہم پوری دھوم دھام سے اسری کو بیاہ کر لائیں گے۔"

اماں جان نے اعلان کیا تو زیادہ خوشی سے بے قابو ہو کر اسی وقت ان کے گلے لگ گیا۔

زیاد کا رواں رواں رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔

اسری کا تصور ہی اس کے لیے نشاط انگیز تھا۔ اسے بڑی آرزو تھی کہ وہ اسری کو مایوں کی دلہن کی روپ میں دیکھتا۔ تحر نے اس کی دل کے آرزو پوری کر دی تھی اور مایوں کی مووی کسی طرح حاصل کر کے اس تک پہنچا دی۔

"زرد رنگ میں تھی گھر سوٹ میں ملبوس ہوتا کے گجرے باندھے وہ اسے اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا جل جل آنکھوں والا کلوز اپ زیاد نے بار بار فلم ریوائنڈ کر کے دیکھا۔

کچھ دیر بعد کاشف اسے ڈھونڈتا ہوا کھلے احاطے میں آ گیا جہاں زیاد جھنگلے سے بازو ٹکائے کسی غیر مرئی چیز پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کاشف کی آمد سے اس کے حسین تصورات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔

"تم آج کے مہمان خصوصی ہو اور یہاں بیٹھے ہو۔ سب تمہاری گمشدگی کے بارے میں الٹی سیدھی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ آؤ اندر دیکھو تو محفل عروج پہ ہے۔"

کاشف زبردستی اسے اندر لے آیا۔ واقعی اندر محفل عروج پہ تھی۔ گی اسٹیج سے اتر کر شائقین کے درمیان تھرک رہی تھی۔ "ایک اشارے کی دیر ہے۔" جمیل نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

اس کا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا۔

"میری محبت، چاہت، ہر جذبہ اب امرتی کی امانت ہے۔ خوا مخواہ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

وہ فارم ہاؤس سے نکل کر باہر ایک قطار میں کھڑی گاڑیوں کے پاس آیا جس میں اس کی بلیک اکارڈ بھی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اپنے کندھے پہ کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے پلٹا بے اختیار اس کے سینے سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی وہ فخر تھا۔

"میں تمہارے ساتھ واپس حویلی جاؤں گا یہاں تو ایک طوفان بدتمیزی برپا ہے۔" فخر کے لہجے میں تلخی تھی

"رات بھی تو بہت ہو گئی ہے دو بجنے والے ہیں۔" زیاد نے کلائی پہ بندھی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔

"تم بھی آرام سے جا کر سو جانا تا کہ صبح جلدی ہو جائے۔" فخر نے اسے چھیڑا تو وہ مسکرانے لگا۔

"صرف آج کی رات ہی تو بیچ میں حائل ہے۔" وہ زیر لب بولا اور گاڑی ریورس کر کے موڑنے لگا۔

سفید حویلی میں رت جگا منایا جا رہا تھا۔

شب کے پرسکون سناٹے کو ڈھول اور شہنائی کی آوازیں ایک تسلسل سے مجروح کر رہی تھیں۔ ادھر فارم ہاؤس میں آتش بازی جاری تھی۔ سب اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

امرتی کو یہ آوازیں اپنا تمسخر اڑاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کی نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ وقت آج رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آنے والی ٹی تھی۔

"آپ تیار ہو جائیں بی بی جی۔" وہ ایک جملہ بول کر غڑاپ سے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

ابھی آدھا گھنٹہ پیشتر اسریٰ کا کمرا لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ان کی تیاریوں میں خاص جوش و خروش نہیں تھا یوں لگ رہا تھا وہ مارے باندھے بس بول رہی ہیں۔ مہمان بھی کوئی خاص نہیں تھے۔ بس اپنے رشتہ دار اور کچھ جاننے والے مدعو تھے۔ لڑکی والوں کی آج کوئی رسم یا تقریب نہیں تھی اس لیے سب بے فکر تھے۔

البتہ مردانے میں خاصی چہل پہل تھی۔ باراتیوں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی ملازمین کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر سونے چلے گئے۔ اسریٰ کا کمرہ بھی خالی تھا۔ بڑی عمر کی خواتین پہلے ہی آرام کے لیے جا چکی تھیں۔ باقی لڑکیوں کے لیے شمی نے کشمیری قہوہ تیار کیا۔ جسے پینے کے بعد سب کو ہی نیند آنے لگی۔

اسریٰ نے باتھ روم میں جا کر دوسرے کپڑے پہنے۔ موتیا کے گجرے بالوں اور کلائیوں سے نوچ کر وہیں پھینکے۔ ہاتھوں اور پاؤں پہ لگی مہندی کا البتہ فی الحال کوئی علاج نہیں تھا۔ بڑی سی چادر لوڑھے وہ بالکل تیار تھی۔ ہر آہٹ پہ دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ اسریٰ کو تو ڈھیروں پسینے آنے لگے۔ زرین بلی کی چال چلتی اسریٰ کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا بڑا خوبصورت سا شولڈر بیگ دبا ہوا تھا۔

"اسریٰ! اس بیگ میں کچھ رقم، تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر ضروری چیزیں ہیں اور یہ میری طرف سے ہے جب عزت، موت اور زندگی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا تو یہ تمہاری مدد کرے گا۔" اس نے وزن میں ہلکا اور چھوٹا سا ریوالور اسریٰ کی طرف بڑھایا۔

"مختصر تمہیں سید حالا ہور پہنچائے گا اور یہ ہائیڈووکیٹ عالم درانی کا وزیٹنگ کارڈ اور ایڈریس۔ انسانی حقوق کا یہ نامی گرامی وکیل ہے اسے میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد میں رابعہ کو بھی سب کچھ بتا دوں گی۔ اب جلدی کرو! بیمانہ ہو کہ تاخیر سے ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔

"زرین! تم جس طرح میری مدد کر رہی ہو میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھولوں گی اگر زندگی رہی تو تمہارا احسان اتارنے کی کوشش کروں گی۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔" زرین نے کچھ اور روپے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمائے پہلے شمی باہر نکلی اس کے بعد زرین کے ساتھ اسریٰ نکلی۔

شمی حویلی کی پچھلی سمت میں چلتی جا رہی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں نوکروں کے لیے

چھوٹے چھوٹے کمرے بنوائے گئے تھے بعد میں حویلی کی تزئین و آرائش کے سلسلے میں جب پچھلی طرف تعمیر کیے گئے تو اس حصے کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا۔ نوکر نئے حصے میں منتقل ہو گئے یہ حصہ ویران ہی رہا۔ اس طرف آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ عقبی سمت کی دیوار کی لمبائی پانچ فٹ کے برابر تھی اور یہاں کوئی پہرا بھی نہیں تھا۔ اسری ثمی کے ساتھ اسی طرف سے باہر نکلی۔ دیوار کے ساتھ ثمی نے پہلے ہی ایک پرانا سا اسٹول لا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے اسری کو دیوار پہ چڑھنے میں مدد دی۔ ثمی نے پہلے دیوار سے چھلانگ لگائی۔ وہ دیہاتی تھا۔ پلی بڑھی تھی بڑے آرام سے پانچ فٹ اونچی دیوار سے باہر کی طرف کود گئی۔ اسری البتہ ڈر رہی تھی۔ ثمی کے حوصلہ دلانے پہ اس نے کودنے کے بجائے لٹک کر اترنے کو ترجیح دی۔ اس کوشش میں اس کی کہنیاں چھل گئیں مگر اس وقت یہ تکلیف بے معنی تھی۔

زرین نے بالکل پہلے کی طرح پرانی جگہ پہ رکوادی۔ ثمی اسری کو غضنفر کی گاڑی کے پاس چھوڑ کر دوبارہ دیوار کے ذریعے حویلی میں آ گئی۔

غضنفر نے گاڑی حویلی کے داخلی گیٹ سے کافی دور مخالف سمت میں کھڑی کر رکھی تھی۔

اسری جونہی اندر بیٹھی اس نے فوراً اسٹارٹ کر دی۔

وہ سڑک سے ہٹ کر کچے راستے پہ جا رہا تھا۔ اسری نے اس کا چہرا دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچا راستہ بہت خراب اور ناہموار تھا۔ مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ دو روز پہلے ہونے والی بارش کی وجہ سے ٹائر بار بار پھسل رہے تھے۔ غضنفر کو گاڑی ڈرائیو کرنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ غضنفر نے کچھ دیر بعد اسے مخاطب کیا۔

"وہ کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے خاصی اپنائیت سے سوال کیا جو اسری کو بہت برا لگا۔

"تمہیں کیا میرا جو نام بھی ہو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔" غضنفر کے لبوں پہ زہریلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ایک نوکرانی ہو کر اتنا غرور، ذرا یہاں سے نکلوں تو اس کا سارا غرور ناک کے راستے نکال باہر کیا تو اپنا نام بھی غضنفر نہیں۔" اس نے دل میں سوچا غضنفر شمی کا جھوٹا تھا شادی کے بعد وہ بیوی کو شہر لے گیا۔ عورتوں کے معاملہ میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ فراڈ دھوکہ بازیوں کے ذریعے دوسروں سے رقم بٹورنا اس کا کام تھا۔ جس کام سے بھی اسے اضافی آمدنی کی امید ہوتی۔

وہ جائز ناجائز دیکھے بغیر اسے کر گزرتا۔ اپنے جیسے لوگوں میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ آج کل بیوی کے ساتھ گاؤں آیا ہوا تھا۔ زرین بھی اسے پہچانتی تھی کیونکہ شہباز کے پاس اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اس کی شہرت سے بھی واقف تھی۔ شمی کے توسط سے راز داری کا وعدہ لے کر اس نے خضر سے اپنے کام کا کہا۔

پیسے کے بارے میں سنتے ہی خضر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک معمولی سے کام کے اتنے پیسے۔ اسے ایک لڑکی کو گاؤں سے باہر پہنچانا تھا اور بس۔ زرین نے لڑکی کے بارے میں اسے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ تجسس کے باوجود وہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکا ہاں زرین نے اتنا ضرور کہا کہ یہ ہمارے ملازم کی بیٹی ہے۔ اب اس ایک جملے سے پوری کہانی بنانا خضر کا کام تھا۔ شمی کو لاکھ کریدنے کے باوجود اس نے ایک لفظ پھوٹ کر نہ دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ خضر کی نیت میں کچھ کچھ فتور آ گیا تھا۔

"کیا ہے اگر شہر پہنچانے سے پہلے میں بھی اس بہتی ندی میں ہاتھ دھولوں کسی کو کیا پتہ چلے گا اور کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا۔" اس کے شیطانی دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔

"اس سوچ پہ اس کا دماغ اس بری طرح اٹکا کہ اسے سامنے موجود گڑھا دیکھنے کے باوجود دکھائی نہ دیا۔ گاڑی کا اگلا ٹائر اس گڑھے میں جا پھنسا تو ایک دم توازن بگڑ گیا گاڑی ایک سائیڈ سے ترچھی ہو گئی۔ خضر زیر لب گالیاں بکتا نیچے اترا اور گڑھے کا معائنہ کرنے لگا۔

کچے کے ساتھ ساتھ جاتی پکی سڑک پہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایکدم خوفزدہ ہو گیا اس نے دعا کی کہ کاش گاڑی میں موجود افراد کی نظر اس پہ نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے اس طرح اس کا بھانڈا پھوٹ جائے کیونکہ زرین نے بار بار اس سے کہا تھا وہ کسی قسم کا رسک نہ لے۔ ساٹھ ہزار کے لیے وہ ویسے بھی رسک لینے پہ تیار نہیں تھا اس لیے وہ تو کچے راستے پہ ڈرائیونگ کرتا آیا تھا۔

ارے یہ کون بیوقوف کا بچہ ہے۔ اچھی بھلی سڑک ہوتے ہوئے اس راستے پہ گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔ مگر یہ کیا یہ تو رکی ہوئی ہے۔ نزاد ذرا گاڑی روکنا میں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ شاید ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ فخر اتر کر سنبھل سنبھل کر پاؤں جماتا کریم کلر کی سوزوکی ایف ایکس کے پاس پہنچا جہاں کوئی سایہ کھڑا تھا۔

"کون ہو تم اور کیا مسئلہ ہے؟" وہ کڑک کر بولا۔ خضر، ملک فخر کو فوراً پہچان گیا۔

"ملک صاحب آپ!"

"خضر! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" فخر کی حیرت فطری تھی۔ اتنے میں زیاد بھی ہیڈ لائٹس جلتی چھوڑ کر فخر کے پیچھے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی جو اس نے روشن کر لی تھی۔ فخر کی طرح وہ بھی خضر کو دیکھ کر حیران ہوا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟"

"گاڑی کا اگلا ٹائر گڑھے میں پھنس گیا ہے، ملک صاحب۔" وہ حد درجہ انکساری سے بولا۔

"تمہیں پتہ ہے جس راستے پہ تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ وہ خراب ہے۔"

"بس جلدی میں غلطی ہو گئی مائی باپ، اصل میں اچانک ہی میری ساس کی طبیعت خراب ہو گئی جلدی جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا مین روڈ تک جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔" خضر نے لولا لنگڑا سا جواز پیش کیا۔

"اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟"

"ڈسپنسری لے کر جا رہا ہوں؟"

"رات کے ڈھائی بجے؟" فخر نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"وہ جی ڈسپنسر رفیق سے میری اچھی دعا سلام ہے اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔" خضر نے دل میں ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

"اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آ جائیں۔ ہم گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مل جل کر یہ کام ہو گا۔"

زیاد نے گم صم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے اسری کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا جس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیاد ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا جو نہی اسری باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ نے ایک مانوس سی خوشبو کو فورا محسوس کیا یہ پرفیوم اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ ابٹن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنی حسن کو فزوں تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ تین روز پہلے والیہ بھابھی، ثانیہ بھابھی، علینہ اور دیگر لڑکیوں نے اسے وجو کے سے گھیر کر اسے بھی ابٹن

لگانے کی کوشش کی تھی۔ غضنفر نے شرط لگائی تھی کہ جس وقت پیرا سے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے گھیرے سے نکل آیا۔

"غضنفر کی ساس خاصی خوش مزاج لگتی ہے۔"

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا اور بالکل بے دھیانی میں روشنی دائرہ اسری پہ رکا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس ہاتھ سے اس نے چادر کا گھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا اس نے فوراً سنبھلتے ہوئے چادر درست کی۔

نیاد کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا اس نے غور کیا۔

"غضنفر کے ساتھ اس کی ساس نہیں ہے یہ تو کوئی لڑکی لگ رہی ہے کیونکہ ہاتھوں پہ میں نے مہندی کے نقش و نگار دیکھے ہیں البتہ چہرا نہیں دیکھ سکا۔"

"تو یہ بات ہے۔" غضنفر اور بھی گھبرا گیا جب انہوں نے اس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا پھر زیادہ کرارا سا تھپڑ کھا کر راہ راست پہ آ گیا۔

"میں بے قصور ہوں۔ یہ لڑکی خود میری گاڑی میں بیٹھی ہے۔ کہہ رہی تھی مجھے شہر پہنچا دو۔ کسی وکیل کا نام لے رہی تھی۔ مجھے نہیں پتہ کون ہے یہ۔ میں تو انسانی ہمدردی کے ناطے مدد کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔ میں نے سوچا جوان لڑکی ہے یہ نہ ہو کسی بدفطرت کے ہتھے چڑھ جائے۔ اس لیے بٹھا لیا۔"

وہ صفائی دے رہا تھا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"میرے دوست کی ہے جی۔"

"میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا؟" غضنفر کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔

اسری نے ایک طرف بھاگنے کا سوچا مگر اپنی بے بسی پہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

غضنفر نے اس کے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔

نیاد نے غضنفر کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ دھکا دیا۔ ایف ایکس بھی گڑھے میں پھنسی ہوئی تھی۔

"تم ذرا یہاں ٹھہرو میں ان محترمہ سے پوچھوں کون ہیں اور آدھی رات کو کس وکیل کے پاس جا رہی تھیں؟"

''کون ہو تم لڑکی! ذرا اپنے چہرے سے چادر ہٹاؤ۔''

''ہم سے ڈرو مت، ہم شریف لوگ ہیں اگر مظلوم ہو تو تمہاری مدد کریں گے جہاں کہو گی پہنچا دیں گے۔کم از کم خضر کی طرح ناقابلِ اعتبار نہیں ہیں۔فخر کا لہجہ نرم سا تھا اس کے پاس اعتبار کر لینے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔اسریٰ نے چادر چہرے پر سے ہٹائی تو فخر کو جھٹکا سا لگا۔یہ تو ڈاکٹر اسریٰ تھی۔زیاد کی جانِ جہاں، جس کے حصول اور محبت کے لیے وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''کون ہے فخر؟ کیا اپنے ہی گاؤں کی لڑکی ہے جو بت بن گئے ہو۔'' زیاد بھی اس کے پاس آ گیا فخر پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ زیاد کا دھواں دھواں ہوتا چہرا دیکھے۔

''او مائی گاڈ!'' زیاد کے ہاتھ سے ٹارچ گر پڑی۔اسریٰ نے ایک بار بھی ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔فخر نے اس موقع پہ اپنے حواس برقرار رکھے اور خضر کے پاس آیا۔یہاں سے بھاگ جاؤ۔صبح گاڑی لے جانا۔اس واقعے کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔کیا تمہیں واقعی نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے؟

''ملک صاحب! آپ یقین کریں مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔''

خضر سچ بول رہا تھا۔جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق وہ ایک طرف تیز تیز چلتا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ساٹھ ہزار اس کی جیب میں تھے۔زرین نے کہا تھا اگر وہ پکڑا جائے تو یہی کہے کہ مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔اس نے سن وعن یہی جملہ دہرایا تھا۔اتنی آسانی سے جان بچ گئی تھی ورنہ ایک لڑکی کے ساتھ بچ نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

''زیاد! حویلی چلو شہباز انکل کے پاس۔'' فخر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جو اس نے فوراً جھٹک دیا۔

''یہ میری منکوحہ ہے۔آدھی رات کو ایک غیر آدمی کے ساتھ پائی گئی تم کہہ رہے ہو حویلی چلو، میں، میں اسے مار ڈالوں گا۔'' اسریٰ کھڑے کھڑے دھڑام سے نیچے گری۔

''زیاد! ہوش مندی سے کام لو یہ کام جوش سے نہیں ہوش سے کیے جاتے ہیں۔ابھی کسی کو پتہ نہیں ہے۔آؤ انہیں گاڑی میں بٹھائیں اور انکل شہباز کے پاس چلیں وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ یہ سب کیا ہے۔بدگمانی اچھی نہیں ہوتی اور تم تو جو محبت کے اتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے رہے ہو۔کس آسانی سے کہہ دیا میں اسے مار ڈالوں گا۔کیا بھول گئے یہ وہی ہے جس کے ملن کی آس میں تمہارا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔''

"مگر فخر! وہ آدھی رات کو خضر کے ساتھ کون سے وکیل کے پاس جا رہی تھی۔"

"اگر مگر کچھ نہیں وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ حویلی چلو سب پتہ چل جائے گا۔"

فخر گھوم کر پچھلی سمت میں آیا اسریٰ زمین پہ بے ہوش پڑی تھی۔ جب کہ ان کی اکارڈ سڑک پہ تھوڑی دور ہی کھڑی تھی۔

"زیاد! انہیں اٹھا کر گاڑی تک لے چلو، یہ بے ہوش ہیں۔"

اسریٰ، فخر سے چھوٹی تھی مگر وہ بڑے احترام سے بول رہا تھا۔ وہ سنگ سا گیا۔ گرتے وقت بھی شولڈر بیگ اسریٰ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا جو اب زمین پہ ایک طرف پڑا تھا۔ زیاد پنجوں کے بل اسریٰ کے پاس بیٹھا جلتے کڑھتے ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا۔ کچھ دیر پہلے تک جب وہ فام ہاؤس میں تھا تو ملن کی اولین ساعتوں کا تصور کر کے ہی اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔ اب اسے چھو کر زیاد کے دل میں کوئی پھول نہیں کھلا اس نے اسریٰ کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی تک پہنچایا ہر احساس سے عاری ہو کر۔ فخر کے ہاتھ میں اسریٰ کا بیگ تھا۔

حویلی پہنچنے تک ان دونوں کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری رہی۔ ہر طرف سناٹا اونگھ رہا تھا۔

حویلی کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہیں اس حادثے کا پتہ ابھی کچھ دیر پہلے چلا ہے کیونکہ اسریٰ کے کزن اس کی تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔

سلطانہ خاتون اپنے شوہر شہباز کے ساتھ کل ہونے والی تقریب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ سونے سے پہلے حسب معمول انہوں نے ساری حویلی کا چکر لگایا۔ زرین سے یہاں پہ غلطی ہوگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اپی جان سو چکی ہیں مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اسریٰ کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ زرین سے یہ دوسری بڑی غلطی ہوئی کیونکہ اسریٰ لائٹ جلا کر سونے کی عادی تھی۔ اب تو سلطانہ خاتون کو بھی اس کی اس عادت کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول کر اسریٰ کو دو تین بار آواز دی مگر جواب ندارد۔ لائٹ جلائی گئی تو ماجرا کھلا۔

"شہباز انکل! اسریٰ ہماری گاڑی میں ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ انہیں ابتدائی طبی امداد کی ضرورت ہے تایا ابا۔"

فخر اور زیاد [illegible] تک [illegible] میں بیٹھے ہو [illegible]۔ زندگی بھر شہباز کی بھی یہ حالت نہیں ہوتی تھی جو اس وقت ہو [illegible]۔ فخر نے [illegible] یہ بات جان کر چھپائی تھی کہ اسریٰ خضر کے ساتھ جا رہی

تھی۔ اس نے یہی کہا کہ امرتی انہیں سفید حویلی جاتے ہوئے راستے میں ملی۔ فخر کو احساس تھا کہ اس کا بیان بہت کمزور اور جھول دار ہے مگر شہیار کی اس پر یقین کر لینے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔

کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھے رہے۔ ان کی ساری زندگی کی کمائی، بس فخر و ناز اور عزت ہی تو تھی جسے امرتی نے کس بُری طرح روندنے کی کوشش کی۔ کل اس کی رخصتی تھی۔ اس نے تو ان کے منہ پہ کالک ملنے اور شکست فاش دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہیں اس بات کا بھی اچھی طرح پتہ تھا اگر زیاد نے شادی سے انکار کر دیا تو شرط کے مطابق نئی زرین کو ملک انور کی بہو بنانا ہی پڑے گا کیونکہ زیاد کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنے تیز و تند جذبات کے طوفانی ریلے کو چھپائے بیٹھا ہے۔

"امرتی بی بی

جھلی ہے۔ پاگل ہے۔ اس کے میرے ساتھ کچھ اختلافات ہیں۔ اس نے اپنے جذبات مجھ تک پہنچانے کے لیے یہ غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔"

انہوں نے تمہید باندھی۔

"بہت خوب، وہ شادی کے گھر سے رات گئے نکل کر جانے کہاں جا رہی تھی اور آپ کچھ اختلافات کا نام لے کر اپنی جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔"

زیاد کے منہ میں جو کچھ آیا بولتا چلا گیا۔ اتنے میں امرتی کے دوسرے چچا بھی آ گئے۔ معاملہ بہت سنگین رخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ فخر نے کئی بار ہاتھ دبا کر زیاد کو خاموش رہنے کو کہا مگر وہ تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے ذرا معقولیت کا مظاہرہ کرو۔" فخر نے رسان سے سمجھایا وہ خفگی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم کہنا چاہتے ہو سب تم کہہ چکے ہو فخر! تمہیں پتہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو کوئی بھی مرد دل بہلانے کا سامان تو بنا سکتا ہے مگر زندگی بھر کا ساتھ نہیں۔"

"یہ وقت بہت نازک ہے اگر ہم اس موقعے پر پیچھے ہٹ گئے تو ہر کوئی ہم پر تھو تھو کرے گا۔ لوگ کہیں گے بڑی شان سے بیاہنے چلے تھے۔ مجھے یقین ہے۔ حویلی سے باہر ہم دونوں کے سوا کوئی بھی اس بات سے واقف نہیں ہے۔ سو پردہ پوشی ہی بہتر ہے بعد

میں دیکھا جائے گا۔"

"ہاں زیاد بیٹا! فخر ٹھیک کہہ رہا ہے تم کل کا دن گزرنے کے بعد اسری کو بے شک گولی مار دینا مگر اس وقت میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم نے اس نازک وقت میں ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ شہباز کی مغرور گردن اپنے دشمن کے بیٹے کے آگے جھک گئی۔" اور وہ جو میری غیرت کا جنازہ نکالنے چلی تھی۔ اس کا حساب کون دے گا؟"

"زیاد بیٹا! یقین کرو اسری ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔"

"پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا ہے؟" اب شہباز کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا سچ بول کر ہی وہ اپنی انا کو سلامت رکھ سکتے تھے۔

"میں نے اسے شہر سے لا کر حویلی میں محصور کر رکھا تھا۔ اسری کے نکاح کی خبر اس کی بہن تک کو نہیں ہے۔ میں نے اسے نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی صورت اس نے اندرونی بجز اس کو باہر تو نکالنا ہی تھا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں ایک بار پھر تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں خدارا! میری عزت کا خیال رکھنا۔"

چشم فلک نے ایک عجیب سی تماشا دیکھا۔ زندگی بھر دوسروں سے رعونت زدہ لہجے میں بات کرنے والا انھیں حقیر سمجھنے والا اونچی گردن والا شہباز گیلانی اپنا اونچا شملہ اتار کر زیاد کے پاؤں میں رکھنے لگا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہیں زرین تبادل کے طور پہ تاوان میں نہ چلی جائے۔ اولاد کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے انسان کو پستی میں گرا دیتی ہے۔

فخر نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے بھی زیاد کو قائل کرنے کے لیے اپنی عزت کا واسطہ دیا۔

"انکل! میں اسری سے بات کرنا چاہتا ہوں اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو۔" شہباز گیلانی اٹھ کر فخر کے ساتھ ہو لیے۔ زیاد وہیں بیٹھا جوتے سے قالین کریدتا رہا۔ اس کے چہرے پہ تا حال کبیدگی کے آثار تھے۔

اسری فق چہرے کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے موت کے سائے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے بالکل بھی رعایت کی خوش فہمی نہیں تھی۔

تینوں خواتین اسری کے پاس موجود تھیں۔ شہباز نے انہیں کمرے سے نکال دیا۔ اسری نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

"فخر بیٹا! اندر آجاؤ۔" شہباز نے خشمگیں نگاہوں سے اسریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے فخر کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔

"انکل معاف کیجیے گا۔ میں تنہائی میں ان سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بڑی شائستگی سے بولا تو ناچار وہ باہر نکل گئے۔ کچھ دیر وہ اسریٰ کے لرزتے وجود کو دیکھتا رہا اور پھر دوستانہ لہجے میں بولا۔

"میری طرف دیکھیں اسریٰ! میں فخر ملک ہوں زیاد کا دوست اور پھوپھی زاد۔"

فخر نے اپنا تعارف کرایا۔

"پلیز آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ اگر مجھ پہ اعتبار ہے تو میرے چند سوالوں کا جواب دے دیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ آپ نے کیا کر ڈالا۔"

فخر کے لہجے میں ہمدردی محسوس کرتے ہی اسریٰ سسک سسک کر رونے لگی۔

"میں نے انتہائی مایوسی کے سرے پہ جا کر یہ فیصلہ کیا میری سوچ یہی تھی کہ شاید میری بقا اسی میں ہے۔"

"آپ اتنی تعلیم یافتہ۔ کم از کم یہ احمقانہ قدم......" فخر خاموش ہو گیا۔

"مجھے پتہ تھا۔ سفید حویلی میں انسان بھی پائے جاتے ہیں شائستہ اور نرم دل انسان۔"

اسریٰ کے اس ایک جملے میں جو راز پنہاں تھا۔ فی الحال فخر کی عقل اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

"آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں۔" فخر نے اس کے سر پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"کچھ گھنٹے پیشتر زرین نے بھی یہی..... " خیال آنے پہ اسریٰ نے فوراً باقی جملے کا گلا ہی گھونٹ دیا۔

فخر واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ زیاد وہاں نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ واپس گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا اور فخر کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"انکل! جو بات چھپی ہے اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہے ورنہ یہ دشمنی کے ایک نئے محاذ کو کھول سکتا ہے۔ اسریٰ زیاد کی امانت ہے ہم کل وقت مقررہ پہ آئیں گے...... آپ اب کسی اور کے سامنے یہ قصہ مت چھیڑیے گا۔" فخر نے سنجیدگی سے کہا اور باہر آ گیا۔

زیاد کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ فخر کو آتا دیکھ کر زوردار آواز میں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کا تپا تپا سرخ چہرا دیکھ کر خاموش ہو گیا مگر پھر رہ نہ سکا۔ حویلی کی سڑک کراس

کر کے وہ جونہی دو رویہ راستے پہ آئے تو فخر نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔

"زیاد تم نے بجھا اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ عقل سے کام لو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

"خاموش ہو جاؤ فخر! تمہیں اس کی وکالت کرنے کے کتنے پیسے ملے ہیں۔ کیا اچھا نہیں کیا ہے میں نے۔ شہید گیلانی نے اپنا شملہ اتار کر میرے قدموں میں رکھنا چاہا اگر اس کی بزرگی کا خیال نہ ہوتا تو یقین کرو میں اسریٰ کو اپنے ہاتھ سے مار دیتا اور اس پہ مجھے افسوس بھی نہ ہوتا رات کے اندھیرے میں فرار ہونے والی لڑکی کو گولڈ میڈل پہناؤں اگر تم نے میری طرح ٹوٹ کر محبت کی ہوتی تو تمہیں پتہ چلے کہ جب اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اس جذبے کا خون ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔"

"زیاد! تم بھی بہت سی باتوں سے لاعلم ہو اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اسریٰ کو استعمال کیا گیا ہے تو...... خدا کی مصلحت پہ میرا ایمان اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اسریٰ کا ہم سے ٹکرانا بے سبب نہیں ہے۔ شمی اور مظہر کا آپس میں قریبی رشتہ ہے اس حوالے سے میں شمی کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔ تم خوامخواہ کے شبہات کو دل میں جگہ مت دو۔ اسریٰ کا دامن آلودہ نہیں ہے۔ اسریٰ ایک پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہے، ڈاکٹر ہے آخر کچھ تو ایسا ہوا ہوگا جو وہ رات کے اندھیرے میں یوں چوروں کی طرح گھر چھوڑنے پہ مجبور ہوئی۔ مجھے انسانوں کو پرکھنے کا دعوا تو نہیں ہے لیکن اسریٰ کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے غلط نیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالا ہوگا۔"

زیاد چپ چاپ سامنے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

آنے والی پیشانی کا رخ مڑ گیا تھا۔ فخر انہیں یقین دلا کر رخصت ہوا تھا۔ وہ اسی وقت اسریٰ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ پہلے ہی سلطانہ خاتون کے تیز و تند لفظوں کے حملوں کی زد میں تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا، جب شمی کی چیخوں سے ساری حویلی گونج اٹھی۔

"الٰہی خیر!" سلطانہ خاتون نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔

شمی کی چیخوں کا سبب جاننے کے لیے وہ سب کمرے کی طرف تیزی سے بڑھتیں۔

ان کی دیورانیاں اور دیوروں کے حواس باختہ چہرے ادھر سے پیچھے ہی تھے چند سیکنڈز کے اندر اندر ہی سب سوئے ہوئے نفس جاگ اٹھے۔ ہر کوئی ان آوازوں کا سبب جاننے کے لیے بے تاب

نظر آ رہا تھا۔

پھر شہباز گیلانی اور سلطانہ خاتون نے اپنی زندگی کا روح کھینچ دینے والا دلخراش منظر دیکھا۔ شمی ابھی تک ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی اب اس کی آواز میں سلطانہ خاتون کی آواز سمیت اور کئی آوازیں بھی شامل تھیں۔

انسان زندگی کی ہوس میں کیا کچھ کر گزرتا ہے اور اس نے موت کو گلے لگا لیا تھا۔

ہائے! اسے کون بتاتا ابھی تو بھری بہاروں کے موسم ہیں اور اس نے بہاروں میں خزاں کا دائمی رنگ شامل کر دیا تھا۔

جدائی کا ابدی رنگ۔

اپنی امی کے ساتھ ذرا سا ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار، صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سونپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

صولت گیلانی کی طرف سے جب اسے شادی کا پیغام ملا تو ہاشم ساڑھے چار کا تھا۔ نگار صولت کی ایک دور پرے کی خالہ کی بیٹی تھی۔ اپنی نرم دل فطرت اور من موہنی صورت کی بنا پر صورت کو نگار بہت اچھی لگتی تھی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی کے بیٹے شہباز کو جو پہلی بیوی سے تھا۔ باپ کی دوسری شادی بالکل بھی اچھی نہیں لگی خاص طور پہ ہاشم۔ اس نے اس سے خدا واسطے کا بیر باندھ لیا تھا سرخ وسفید گپلو سا سنہرے بالوں والا ہاشم سب کو ہی اچھا لگنے لگا تھا یہاں تک کہ صولت کی پہلی بیوی صوفیہ بھی اسے بے حد چاہنے لگی تھی۔

شہباز خود سوکھا سڑا، بھدے نقش والا ایک زرد رو لڑکا تھا اور اپنی شکل وصورت کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ ہاشم کو ذرا ذرا سی بات پہ وہ پیٹ ڈالتا۔ جب بھی صولت سے شکایت کی جاتی۔ وہ شہباز کا مزاج درست کرنے کا وعدہ کرتے مگر عملاً انہوں نے کبھی بھی اسے یہ نہیں سمجھایا کہ ہاشم تمہارا بھائی ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو۔ کون سا ہاشم ان کا سگا بیٹا تھا جو وہ اپنے بیٹے کیسر زنش کرتے۔

وقت گزرتا گیا۔ شہباز کالج میں اور ہاشم مڈل اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا تھا جب شہباز کی

سگی پھوپھی اور پھوپھا گھر میں اچانک آگ بھڑک اٹھنے سے جھلس گئے ابتدائی طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ اس شب ان دونوں کی اکلوتی اولاد زری اپنے ماموں صولت کے گھر کھیلتے کھیلتے وہیں سو گئی تھی۔

اب ماموں کا گھر اس کا مستقل ٹھکانہ تھا۔

چھ سالہ زری اور دس سالہ ہاشم کا درد مشترک تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آجاتی اور اس سے کہانیاں سنتی۔ شہباز نے کالج چھوڑ دیا تھا۔ اسے تعلیم سے بالکل لگاؤ نہیں تھا اب تک بھی مارے باندھے ابا کے ڈر سے پڑھ رہا تھا۔ مسلسل غیر حاضری اور ناپسندیدہ حرکات کے باعث پرنسپل اور اساتذہ کرام اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ اسے کالج سے نکال دیا جاتا شہباز نے (اپنے تئیں) خود ہی اس کالج پہ دو حرف بھیج دیے۔

ہاشم اور زری کی پسندیدگی محبت میں ڈھلک چکی تھی۔

صولت، ہاشم کو بہت پسند کرنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ ذمہ دار اور سمجھدار تھا۔ ان کے بغیر کہے اس نے صولت کے اکثر کام سنبھال لیے تھے جب کہ شہباز جوان کا سگا بیٹا تھا اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

اسے سدھارنے اور گھر کے معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے صولت نے اس کی شادی سلطانہ خاتون سے طے کردی۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ نگار کے ہاں ہاشم کے بعد اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شہباز کی ہاشم سے نفرت کا وہی عالم تھا بلکہ اب تو اس میں اور شدت آگئی تھی وہ شروع سے ہی ہاشم کی ہر پسندیدہ چیز اس سے چھینتا آیا تھا۔ زری اور اس کی محبت بھی اچانک ہی اس کی نگاہ میں آئی تھی۔

نرم و نازک سی زری اسے بھی بہت اچھی لگی تھی۔ پھر وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ وہ ہاشم کے قبضے میں چلی جائے۔

اسے زری سے محبت یا عشق نہیں تھا۔ وہ تو بس اسے اس کے حسن اور ہاشم سے محبت کے صلے میں کسی طرح بھی نیچا دکھانا چاہتا تھا سو ایک روز بڑے آرام سے صولت گیلانی سے کہہ دیا کہ......

"میں زری سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

یہاں پہ اسے شکست فاش ہوگئی کیونکہ صولت گیلانی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ

زری کی شادی ہاشم سے کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ انکار شاید بھی سننے کے لیے زندہ تھی وہ ایک شہکون سے سو گئی۔ کبھی نہ جاگنے کے لیے۔

زری اور ہاشم کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس وقت شہباز کا پہلوٹھی کا بیٹا بارہ تین سال کا تھا۔

شہباز کی حالت چوٹ کھائے ناگ کی طرح تھی۔

شہباز کے دو چھوٹے بھائی اور بھی تھے مگر وہ ہاشم کے ساتھ نارمل طریقے سے ہی پیش آتے صرف ایک شہباز ہی تھا جو دشمن کی طرح کینہ دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔

اس وقت اس کی حالت دیدنی ہوتی جب وہ ہاشم کو زری کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا۔ شادی کے بعد پہلے سال ہی ہاشم ایک بچی کا باپ بن گیا۔

زری کا حسن ماں بننے کے بعد اور بھی نکھر آیا تھا۔ شہباز کو افسوس ہوتا کہ یہ ماہتاب اسے پہلے کیوں نظر نہیں آیا تھا۔ خوامخواہ اس نے سلطانہ خاتون سے شادی کر لی۔ زری عورت تھی۔ شہباز کی بدلی ہوئی نگاہ کیسے نہ محسوس کرتی۔

رابعہ کے بعد اسریٰ پیدا ہوئی۔ وہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ ہاشم دو دن کے لیے لاہور ایک ضروری کام سے گیا ہوا تھا جب زری کو اکیلا پا کر شہباز کے اندر کا شیطان بیدار ہو گیا۔ اس رات اس نے زری کا سارا فخر خاک میں ملا دیا بعد میں ضمیر نے ملامت کیا تو اس نے خود کو یہ کہہ کر بہلا لیا کہ میں نے ہاشم سے اپنی نارسائی کا انتقام لے لیا ہے۔

اسی رات زری نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔ اس باحیا، وفاشناس اور عفت مآب عورت کے لیے اب ہاشم کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ وہ کیسے ہاشم کے سامنے شہباز کے ہاتھوں دیتا گھٹنا چھوڑ کر جاتی سو اس نے اپنی رسوائی کے پل پل ستاتے احساس سے یکدم چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا کیسے اس کے آگے شہباز کی جھوٹن رکھتی۔

دوسرے روز ہاشم واپس لوٹا تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔ اس کی محبت اس کا پہلا عشق، اس کی پیاری بیوی زری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔

رابعہ اور اسریٰ چلا چلا کر رو رہی تھیں ہاشم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے پیچھے اڑتالیس گھنٹے میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دنیا اس کے لیے بے رنگ ہو چکی تھی مگر رابعہ اور اسریٰ کے لیے وہ خود کو سمیٹنے پہ مجبور تھا۔

اس نے کسی سے گلہ نہیں کیا، نہ کسی کو الزام دیا۔ صولت گیلانی کے روکنے کے باوجود حویلی میں نہیں رکا۔ یہ در و دیوار اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے اس گھر کی کمزور دیواریں اس کی محبوب بیوی کو تحفظ دینے میں ناکام رہی تھیں۔

شہر آنے کے بعد بھی ایک سوال اکثر اس کے ذہن پہ ہتھوڑے کی طرح برستا رہتا کہ زری نے آخر خودکشی کیوں کی۔ اسے کس چیز کی کمی تھی۔ ہاشم نے اسے کبھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ صولت گیلانی بھی زری کو بے حد چاہتے تھے..... ان کی دو پیاری بچیاں تھیں۔ گھریلو آرام و سکون میسر تھا، کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ لے دے کر بات پھر وہیں اٹک جاتی۔ زری نے خودکشی کیوں کی؟

صفیہ اس کے جانے کا سن کر رو پڑیں۔ وہ ان کا سگا بیٹا نہیں تھا۔ مگر انہیں سگی ماں کا سا درجہ دیا تھا۔ شہباز سے بڑھ کر وہ ان کے کہے کا مان رکھتا تھا۔ اتنے برسوں میں انہیں ہاشم اور اپنے تینوں بیٹوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ زری سے اس کی شادی ہونے کے بعد ان کی محبت میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسریٰ اور رابعہ پہ وہ بے انتہا شفقت لٹاتی تھیں۔

شہباز نے بھی رسماً روکنا چاہا مگر ہاشم نے وہی کچھ کیا جو اس کے دل میں تھا۔ وہ اسریٰ اور رابعہ کے ساتھ لاہور آ گیا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں سرکاری نوکری کا حصول آج کل کی طرح جوئے شیر لانے کے برابر نہیں تھا۔ اپنے دوست جواد لطیف کے توسط سے اسے فارن آفس میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ رابعہ اور اسریٰ کے لیے ہاشم نے کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جو اسے جواد لطیف نے ڈھونڈ کر دی تھی۔

ملازمت کے بعد تو ہاشم کے پاؤں میں جیسے چکر سا بندھ گیا۔ کبھی اس ملک، کبھی اس ملک، یونہی زندگی کے دن گزر رہے تھے۔

ہاشم کے شہر آنے کے تین ماہ بعد شہباز کے گھر بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اس نے زرین رکھا۔ اس سے جانے شہباز کے کون سے جذبے کی تسکین ہوئی تھی۔ وہ لاڈ میں اسے اکثر زری کے نام سے پکارتا۔

ہاشم کا رابطہ جو خطوط کی صورت میں قائم تھا، صولت گیلانی اور صفیہ بیگم کے انتقال کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا۔ عرصہ دراز سے اسے شہباز، سکندر اور مقبول کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ رابعہ اور اسریٰ کو ہاشم نے حقیقت سے لاعلم رکھنا بہتر سمجھا تھا۔ اس نے انہیں زری

کے حوالے سے یہی بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں ہی وہ فوت ہوگئی تھی۔

اسریٰ کو ماں کے وجود کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ سمجھدار اور معاملہ فہم تھی۔ اسریٰ جذباتی اور تلون مزاج تھی مگر ان دونوں کے دم سے ہی ہاشم کی زندگی برقرار تھی۔ اس نے دوسری شادی کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچا تھا، حالانکہ آبلہ پائی کے اس بنجر راستے میں کئی سایہ دار سرسبز نخلستان بھی آئے تھے مگر وہاں رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔

اب چند برسوں سے وہ پاکستان میں ہی تھا۔ اسریٰ پڑھ رہی تھی۔ رابعہ نے پڑھائی موقوف کر دی تھی۔ برسوں بعد شہباز نے اچانک ہاشم کو کھوج نکالا اور اتنی محبت سے ملا کر ہاشم کو اس کا برسوں پرانا رویہ خواب معلوم ہونے لگا۔

ہاشم خود سے یہ قرار کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ اس کے دل میں بچپن سے ہی شہباز کا نفسیاتی خوف بیٹھا ہوا ہے۔ شہباز کو یوں لگ رہا تھا کہ قدرت دوبارہ اسے وہیں لے آئی ہے۔ اسریٰ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ وہی مسکراہٹ، وہی آنکھیں، وہی سانچے میں ڈھلا وجود۔ زری مجسم ہو کر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ شہباز نے اپنے اندرونی شدت پسند منتقم مزاج انسان کو کبھی سونے دیا ہی نہیں تھا۔ رابعہ اور اسریٰ کو دیکھ کر اسے یہ خیال آیا تھا، اگر وہ انہیں حویلی میں لے جائے اور وہیں خاندان میں ان کی شادی کر دے تو ہاشم کو ایک بار پھر زک دے سکتا ہے۔ اس ہاشم کو جو زری کی موت کے بعد اس کی دسترس سے دور ہو گیا تھا۔ پرانی نفرت جو ہاشم کے لیے گویا اس کے خون میں رچی بسی تھی، دوبارہ ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔

اس سلسلے میں ہاشم کو نرم کرنے کے لیے اس نے اپنے دو ملازم بلا معاوضہ اس کے پاس شہر بھجوا دیے۔

اسریٰ اور رابعہ ان سے مانوس ہو گئی تھیں۔ اسریٰ بڑے پیار سے...... بڑے ابا کہہ کر مخاطب کرتی تو یوں لگتا جیسے زری...... کان میں ہنس رہی ہو۔ بہت مختصر عرصے میں شہباز نے ہاشم پہ اپنا گزشتہ رعب و داب قائم کر لیا۔ ہاشم اس کے زیر اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے خاور کا رشتہ رابعہ کے لیے منظور کر لیا تو شہباز کو اپنا غصہ چھپانا دشوار ہو گیا۔ اپنے تئیں وہ ہاشم کی بیٹیوں کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ بابر نے جب اکبر کو مار مار کر زخمی کر دیا اور روپوش ہوا تو شہباز اسریٰ کے

بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔

زرین کا بے جان جسم پنکھے کے ساتھ جھول رہا تھا۔

شہباز کی نگاہوں میں برسوں پرانا منظر زندہ ہو گیا۔ ذری کی لاش اسی طرح چھت کی کڑیوں کے ساتھ بندھی رسی کے سہارے جھول رہی تھی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ زرین کو کسی شہباز نے بے آبرو نہیں کیا تھا۔

ذری کی خودکشی کی وجہ شہباز تھے جنہوں نے لاعلمی میں زرین کی محبت امبری کو سونپ دی تھی۔ کئی پیچیدگیوں اور سازشوں کے ذریعے انہوں نے زیاد کو امبری کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے زرین کو بھی زیاد کی زندگی میں شامل کر سکتے تھے۔

مگر شاید کاتب تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔

قدرت نے کتنے برسوں بعد انصاف کے اس کیس کو اختتام تک پہنچا کر فیصلہ سنایا تھا۔ ایسا فیصلہ جس سے کوئی بھی انحراف نہیں کر سکتا۔

اس کا انصاف مکمل اور بے داغ ہوتا ہے۔

شہباز کے ساتھ مکمل انصاف کیا گیا تھا۔

کل جس گھر سے امبری کی ڈولی اٹھنی تھی، اس گھر سے آج زرین کا جنازہ اٹھا تھا۔

شہباز صبح سے سکتے کی حالت میں تھے۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔ امبری کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زرین کا آخری لمحات میں لکھا خط اس نے بھی پڑھا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ زرین اتنی گہری جنونی اور بے صبری ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت کر کے امبری کو زیاد کے بارے میں پہلے ہی بتا دیتی تو شاید حالات کچھ مختلف ہوتے۔ اس نے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امبری کے ذہن پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ اتنا زیادہ کہ امبری اس کی پرکشش باتوں میں آ کر رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل گئی۔

اسے اس بات کا ذرا بھی افسوس نہیں تھا کہ زرین نے اسے غلط راہ دکھائی ہے۔ اس نے امبری سے جھوٹ کہا اور گھر سے بھگوا دیا۔ مقصد یہی تھا کہ بات کھل جائے پر اس کا نام کہیں نہ آئے۔ امبری کا کانٹا بھی ہٹ جائے اور وہ اپنی محبت زیاد کو بھی حاصل کر لے۔ اس کی بلا سے امبری بے شک تباہ و برباد ہو جاتی۔

وہ امبری کو زیاد اور عمر کے ساتھ آتا دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے۔

شہباز کی طرح اسے بھی ناکامی سے نفرت تھی اور محبت میں ناکامی سے بچنے کے لیے اس نے موت جیسا کامیاب فیصلہ کیا تھا۔

زرین کی خودکشی کے بعد بدنامی کی جو دھول اٹھی، اس نے شہباز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ خاموش بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ لاکھ اسریٰ کو ان سے شکایتیں تھیں مگر انہیں اس حالت میں دیکھ کر اسے ان پر رحم سا آتا۔

گاؤں میں زرین کی خودکشی کے بارے میں مختلف خبریں گردش کر رہی تھیں جن میں سے کوئی بھی سچ نہیں تھی۔

اسریٰ سب کا بدلا ہوا رویہ نوٹ کر رہی تھی۔ اب وہ سب پہلے کی طرح بیگانگی اور سرد مہری سے پیش نہیں آتے تھے۔

سکندر اور مقبول کو شہباز سے جو شکایتیں تھیں، وہ ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ برسوں کی دبی کدورت ابھر آئی تھی۔ دونوں بھائیوں کو شکوہ تھا کہ شہباز نے انہیں ان کا جائز مقام نہیں دیا۔ وہ اب اپنے جائز مقام کو حاصل کرنے کے لیے جت گئے تھے۔ کیونکہ شہباز کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اکلوتا بیٹا بابر اپنے مشاغل اور مصروفیات میں گم تھا۔ باپ کی دل گیر کیفیت کی اسے بالکل پروا نہیں تھی۔ باپ کی پوچھ گچھ کا خوف رخصت ہو چکا تھا۔

شہباز کی ساری زندگی کی کمائی بابر اور زرین تھے زرین رہی نہیں اور جو رہ گیا، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

بذریعہ خط اور ٹیلی فون رابعہ کو ہونے والے تمام واقعات کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس نے جلد از جلد وطن واپسی کے لیے سیٹ ریزرو کروالی۔

اسریٰ کا مستقبل غیر یقینی سا تھا۔

مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ زیاد ملک سے طلاق لینا چاہتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ہیں۔ مقبول گیلانی نے بڑی نفرت سے کہا تھا۔

"رشتہ شہباز بھائی نے طے کیا تھا۔ بذات خود وہ فرعون بن بیٹھے تھے۔ جرگے کے فیصلے کے نتائج وہی بھگتیں، تمہارا کیا قصور ہے۔ اگر تم آج جرگے کے سامنے یہ کہہ دو کہ تمہیں شہباز بھائی نے زبردستی ڈرا دھمکا کر نکاح پہ مجبور کیا تھا پھر دیکھنا شہباز کا پورے گاؤں میں کیسے جلوس نکلتا ہے۔ کیسی بدنامی ہوتی ہے جرگے والے از سر نو فیصلہ کریں گے جو یقیناً

تمہارے حق میں ہوگا۔"

اسریٰ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مقبول انکل بول رہے ہیں۔ بڑے ابا کے سامنے اس نے انہیں ہمیشہ سر جھکائے مودب بیٹھے رک رک کر بولتے ہوئے سنا تھا۔ آج کس قدر تحقیر اور تضحیک بھرا انداز تھا ان کا۔

سکندر انکل نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

اسریٰ کوشش کے باوجود ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ جب بڑے ابا نے یہ سب کیا تھا تو اس وقت آپ کہاں تھے؟ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

"انکل! میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جیسے تمہاری مرضی مگر وہاں اکیلے گھر میں تم کیا کرو گی۔" مقبول حیرت سے بولے۔

"انکل! رابعہ آپی کل پاکستان پہنچ رہی ہیں، میں اکیلی کہاں ہوں۔ جواد انکل بھی تو ہیں نا۔ ہوسکتا ہے میں آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں یا پھر تہ جاؤں اور جاب کرلوں۔ میری تنہائی کی آپ فکر نہ کریں۔ جواد انکل کی رشتے کی ایک بہن بیوہ ہیں، اولاد بھی نہیں، میں انہیں ساتھ رکھ لوں گی۔"

"ساری زندگی ایسے تو نہیں گزر سکتی نا۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو میں حمزہ کے گھر والوں سے بات کروں مگر پہلے یہ زیاد ملک والا مسئلہ نمٹ جائے۔ تم کسی روز جرگے کے روبرو بیان دو تو کوئی پیش رفت ہو۔" سکندر بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو مبہم سوچوں کی تفسیر بنا تھا۔ جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔

اس نے تیاری مکمل کرلی تھی، سب سے مل کر وہ بڑے ابا کے پاس آئی جو اپنے کمرے میں لیٹے ساکت نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہے تھے۔

اسریٰ نے بھانپ لیا تھا کہ وہ ڈپریشن کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر ان کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار رہتی اور انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ان کے ذہن اور جسم دونوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن نہیں۔

"بڑے ابا! میں واپس شہر جا رہی ہوں اپنے گھر۔"

ان کی ساکت نگاہوں میں اضطراب برپا ہوگیا۔ اسریٰ ان کے سرہانے کھڑی تھی۔

انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جسے امرتی نے فوراً تھام لیا۔ شہباز نے امرتی کو اپنے قریب بیٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگے۔ امرتی ان کے دیکھنے کے انداز سے الجھن سی محسوس کرنے لگی۔ شہباز کے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں مچل سے گئے۔

"بڑے ابا!" وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شہباز نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کی دلدوز آہیں اور زار و قطار آنسو امرتی سے دیکھے نہیں جا رہے تھے۔

"مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ تم اگر چلی گئیں تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے مت چھوڑ کر جانا۔ میں بہت ڈرنے لگا ہوں۔ وہ...... وہ میرے خواب میں آتی ہے۔ اس سے کہو نا، مجھے معاف کر دے۔" ان کے مبہم اور بے ربط جملے امرتی کی عقل سے بالاتر تھے۔ وہ خود ان کے ساتھ رو رہی تھی۔

"تم میری بیٹی ہو نا، میری بیٹی ہو نا، کہو تم میری بیٹی ہو۔" ان کا انداز یکا یک جنونی ہو گیا۔

"کہو، تم میری بیٹی ہو۔" انہوں نے جسم کی ساری طاقت سے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ دروازے سے سلطانہ خاتون کا خوفزدہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے بھی صورت حال کا جائزہ لینے اور تماشا دیکھنے آ گئے۔

"بڑے ابا! میں آپ کی بیٹی ہوں، صرف آپ کی۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اسے پتا تھا کہ بڑے ابا کو اس وقت انتہائی درجے کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں پر ذرا سی بھی کوتاہی کی گئی تو انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ اپنی جان بھی لے سکتے ہیں۔

"بڑے ابا! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اگر گئی تو آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی، اکیلے نہیں چھوڑوں گی۔" وہ انہیں بچوں کی طرح تسلی دے رہی تھی۔

کافی دیر بعد جب وہ پرسکون ہوئے تو امرتی ان کے کمرے میں سے نکل آئی۔ سلطانہ خاتون لاؤنج میں تھیں۔ امرتی ان کے پاس آ گئی۔

"بڑی امی! میں بڑے ابا کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ شہر میں بہت اچھے اچھے ہسپتال ہیں۔ وہاں ان کا بہترین علاج ہو سکے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر اسی حالت میں رہے تو خود کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

سلطانہ کا اترا اترا چہرہ جانچتے ہوئے اس نے جیسے ہی ان کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا تو ان کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم بہت اچھی ہو، کاش شہباز تمہارا تھوڑا سا خیال کر لیتے تو آج ان حالوں کو نہ پہنچتے۔ انہیں تمہاری بددعا لگ گئی ہے۔"

امرتی تڑپ سی تو گئی۔

"بڑی امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے ابا کو کبھی بددعا نہیں دی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی بلکہ جو کچھ بھی ہوا، میں نے اسی میں اوپر والے کی مصلحت جانی تھی۔ پتا ہے میں نے بڑے ابا کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت سے وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے اور اب انہیں اس کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں پہلی فرصت میں بڑے ابا کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا چاہتی ہوں۔"

سلطانہ خاتون کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

"کیسا نرم دل ہے اس کا۔ ہاشم کی طرح کتنی بامروت ہے۔" انہوں نے دل میں خود سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گی بلکہ میں شہباز کو بھی کہہ دیتی ہوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔" سلطانہ اٹھ گئیں۔

امرتی بھی اپنا سامان جو چند جوڑے کپڑوں اور دیگر چھوٹی موٹی اشیاء پر مشتمل تھا، رکھنے لگی۔

مگر چمڑے کا بیگ جس میں اس کے ڈاکیومنٹس اور دیگر ضروری چیزیں تھیں، کہیں نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ اس بیگ میں اس کی عمر بھر کی تعلیمی جدوجہد اور کیریئر بند تھا۔ اگر وہ بیگ نہ ملتا تو سب بیکار تھا۔

قریب تھا کہ وہ رو پڑتی۔ سلطانہ دوبارہ اس کے پاس آ گئیں۔ اس کا اترا اترا سا چہرہ انہیں چونکا گیا۔

امرتی کو یاد آ گیا تھا، جب وہ گھر سے نکلی تھی تو وہ بیگ اس کے پاس تھا۔ یہاں تک کہ جب گاڑی گڑھے میں پھنس جانے کے بعد وہ باہر نکلی تو تب بھی وہ بیگ متاع عزیز کی طرح اس کے پاس تھا۔

"یقیناً وہ... یا ملک کے پاس ہوگا۔" اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔

بیگ زیادی گاڑی [illegible] تھا۔ امرتی کو حویلی میں پہنچانے کے بعد بیگ اس کی گاڑی

میں ہی رہ گیا تھا۔

فی الحال بیگ واپس لینے کی کوئی تدبیر اسکے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

❁

رابعہ بڑے ابا کو دکھ اور تاسف سے دیکھ رہی تھی زرین کی بے وقت ناگہانی موت پہ اسے بے پناہ دکھ ہوا تھا۔

رات کو تنہائی میسر آئی تو اس نے اسریٰ سے تمام واقعات کی تفصیل پوچھی۔

"اسریٰ! میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟"

"میں اس پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔"

"اور تم نے جو احمقانہ فعل سرانجام دینے کی کوشش کی۔ شیم آن یو اسریٰ! اتنی پڑھی لکھی ہو کر...... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ بڑے ابا نے واقعی اچھا نہیں کیا مگر تم نے احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا، وہ بہت غلط تھا۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس جاتیں۔ کیا تمہاری اپنی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔"

"آپی! اگر آپ زرین کی باتیں سنتیں تو شاید یہی کچھ کرتیں جو میں نے کیا۔ اس نے مجھے نفسیاتی طور پہ اتنا کمزور کر دیا کہ میں اس کی کہی گئی ہر بات کو سر جھکا کر مانتی چلی گئی۔ اس نے زیاد اور اس کے گھر والوں کے متوقع سلوک کے بارے میں وہ منظر کشی کی کہ مجھے میرے بھیانک مستقبل سے ڈرا ہی دیا۔"

"اسریٰ! کچھ بھی سہی، تم اگر مجھے ایک بار ہی سب کچھ بتا دیتیں تو شاید سب کچھ اتنا غلط نہ ہوتا۔ تمہیں پتا نہیں ہے، دیہات کے لوگ اپنی عورتوں کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ میں پہلی فرصت میں زیاد ملک سے ملاقات کروں گی۔ اگر وہ میری توقعات پہ پورا اترا تو دیکھ لیں گے۔ میں خود سفید حویلی جاؤں گی۔ یہ فیصلہ دیکھ بھال کر کروں گی۔ تمہارے لیے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب۔"

"ویسے بڑے ابا نے اچھا نہیں کیا۔ ابو کے مرنے کے بعد انہیں سہارا دینا چاہیے تھا نا کہ خاندانی دشمنیوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ ہمارے لیے گڑھا کھود رہے تھے، خود ہی گر گئے۔"

"نہیں آپی! پلیز اور کچھ مت کہیں۔" خفا خفا سی رابعہ کے منہ پہ اسریٰ نے اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔ ''کچھ بھی کہہ لیں، چاہے کے باوجود میں بڑے ابا سے نفرت نہیں کرسکتی، نہیں کرسکتی۔

اپنی محبت تو وہ بری طرح ٹوٹ کر بکھرے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ نفرت کے جواب میں نفرت کی ہی آبیاری کی جائے۔ ہم سزا جزا کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔''

اسریٰ نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا تا کہ رابعہ اس کی آنکھوں میں چھلکتے آنسو نہ دیکھ سکے۔ رابعہ نے زبردستی اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور دھیرے سے بولی۔

''اسریٰ! میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔'' اسریٰ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ رابعہ نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر اسے یقین دلایا۔

''ہاں اسریٰ! ہم بڑے ابا کو دیکھیں گے۔''

''آپی! آپ بھی انہیں میری طرح معاف کر دیں۔ پہلے ہی وہ بہت دکھی ہیں۔'' اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا کہنے میں تکلیف وہ سا تاثر در آیا تھا۔

زری کی موت پہ قدرت نے از خود پردہ ڈال دیا تھا اگر وہ پردہ ہٹ جاتا تو اسریٰ اور رابعہ کے دل میں شہباز کے لیے جو ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ باقی نہ رہتی اور شہباز ان دونوں کی اتنی توجہ اور دیکھ بھال سہہ نہیں پا رہے تھے۔ وہ کیسے انہیں بتاتے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔

اسریٰ نے انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھی۔

ڈاکٹر حمزہ سے اس کی اچانک ملاقات ہوئی۔ وہ انگلینڈ سے واپس آ کر اسی ہاسپٹل میں دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے، جہاں اسریٰ کبھی ہاؤس جاب کرتی تھی۔ وہ اسریٰ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر اسریٰ کی طرف سے سرد مہری کی سی کیفیت تھی۔

''اسریٰ گاؤں سے کب واپسی ہوئی ہے'' ان کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

''میں پچھلے ہفتے ہی آ گئی اس بڑے ابا کے ساتھ۔ انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانا ہے۔ تین چار دن سے ان کی طبیعت کافی خراب ہے بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے۔''

''اوہ آئی سی۔ تو وہ بھی آئے ہیں۔''

حمزہ کا لہجہ سرد تھا جو اسریٰ کو بہت برا لگا۔ اس نے حساب کتاب آئندہ کے لیے اٹھا رکھے۔ اس وقت تو وہ بڑے ابا کے لیے کافی پریشان تھی۔

حمزہ طویل راہداری میں کھڑے آخر تک اسے جاتا دیکھتے رہے۔

زیاد غیض و غضب کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بچھا تھا اور چہرہ اندرونی اضطراب کا غماز نظر آ رہا تھا۔

اماں جی اور انوار ملک خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زیاد کی یہ کیفیت ایک گھنٹے سے اسی طرح برقرار تھی۔

ان کے ایک قابل اعتبار ملازم کے علاوہ حمزہ نے بھی پورے وثوق سے بتایا کہ متبول گیلانی اور سکندر گیلانی امرتی کو جرگے میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ امرتی کا نکاح شہباز نے اسے دھمکیاں دے کر زبردستی کرایا تھا۔

یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔

امرتی کے معاملے میں شہباز کا کردار پوری طرح کھل چکا تھا اور بہت سوں کو امرتی سے ہمدردی بھی تھی مگر زیاد کو تو امرتی سے محبت تھی، اب محبت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی انا کا بھی مسئلہ بن چکی تھی۔ اس کے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ امرتی بھری محفل میں اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کرتی۔

حمزہ تو اس کا بہترین دوست اور راز داں تھا۔ وہ زیاد کے دل پہ پل پل گزرنے والی قیامت سے بخوبی واقف تھا۔ یہ سوال اسے بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر امرتی نے اسے ٹھکرا دیا تو زیاد کا کیا ردعمل ہوگا؟

وقت گزر رہا تھا اور پردۂ غیب سے جانے کیا ظہور میں آنے والا تھا۔

❁

"امرتی! میں آج بہت خوش ہوں، اتنا کہ کائنات مجھے اپنی مٹھی میں بند محسوس ہو رہی ہے۔"

حمزہ کی آنکھوں سے پھوٹتی چمک، لبوں پہ مسکراہٹ اور چہرے پہ طاری سرمستی کی سی کیفیت ان کی اندرونی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی امرتی، حمزہ کے گھر میں تھی۔ حمزہ نے حال ہی میں یہ بنا بنایا فرنشڈ گھر خریدا تھا اور امرتی کو آج دکھانے لائے تھے۔

حمزہ کی طرف سے اس کے دل میں جو بھی ناراضی اور خفگی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ حمزہ نے سچ بہت شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔

امرتی نے تو حمزہ کو معاف کر دیا تھا مگر رابعہ کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔

"میں حمزہ کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی، کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں بہت شرمندہ

ہوں وہ، ہم سب کے جذبات سے کھیلا۔ ابو کو بھی نہیں بخشا" اس کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"آپی! اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے اور اس کنڈیشن میں تو بالکل بھی نہیں۔" اسریٰ اس کے بے ہنگم پھیلتے وجود کو دیکھتے ہوئے شرارت سے ہنسی تو رابعہ جھینپ گئی۔

ڈھائی ماہ پہلے یہ تصور بھی محال تھا کہ اسریٰ کو اتنی خوشیاں ملیں گی۔

شہباز گیلانی کو ہاسپٹل ایڈمٹ ہوئے تیسرا روز تھا۔ جب انھوں نے دنیا کے تمام جھمیلوں سے چھٹکارا پا لیا۔ زرین کی موت کے بعد اندر ہی اندر بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، بلکس رہے تھے، پچھتاوا گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ اسریٰ اور رابعہ کی محبت خدمت گزاری کچھ بھی تو اثر نہیں کر رہی تھی۔ دماغ پہ بے پناہ دباؤ کے باعث ان کی شریان پھٹ گئی۔ آخری وقت میں اسریٰ ان کے پاس تھی۔ سی سی یو میں ان کے پاس کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی مگر اسریٰ نے سرجن انچارج سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔

وہ سفید براق بستر پہ ہوش و خرد سے بیگانہ پڑے تھے۔

آخری وقت شہباز کی بے بس آنکھوں نے اسریٰ کو دیکھا، اس کے پہلو میں زری بھی کھڑی تھی۔ طنزیہ مسکراتی ہوئی وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زری اور اسریٰ کا وجود گڈمڈ ہو رہا تھا۔

شہباز کو اپنا وجود بے جان ہوتا لگ رہا تھا۔ اسریٰ ان پہ جھکی ہوئی ان کے ماتھے پہ پیار کر رہی تھی۔ شہباز کی روح کھنچ کر آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔ زری کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تو صرف اسریٰ تھی، روتی دھوتی اسریٰ۔

شہباز کو گاؤں میں ہی دفنایا گیا۔ سلطانہ خاتون کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ دوسری بار مری ہوں۔

سفید حویلی والے تعزیت کے لیے آئے رابعہ اور اسریٰ بھی گاؤں میں تھیں۔

شہباز کی موت کو چودہ روز ہوئے تھے، جب مقبول اور سکندر نے دوبارہ زیاد اور اسریٰ والا مسئلہ اٹھایا۔

"اسریٰ بیٹی! تم انکار کرو تو تمہیں بہت سے فوائد ملیں گے۔" مقبول گیلانی اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کس قسم کے فوائد؟" وہ انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اگر تم انکار کر دو تو شہباز کی ساری جائیداد ملک زیاد کے قبضے میں چلی جائے گی۔

اس میں سے آدھی تمہاری ہوگی کیونکہ تمہیں ذہنی اور جذباتی طور پر جو کوفت اٹھانی پڑی ہے۔ یہ جائیداد اس کے صلے میں تمہیں دی جائے گی کیونکہ یہ ہمارے یہاں کے قوانین ہیں جس میں عورت کا فائدہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ شہباز کی زندگی میں اگر تم انکار کرتیں تو معاہدے کی رو سے وہ زمین کو ان کے حوالے کرتا۔ اگر شہباز کی بچی نہ ہوتی تو وہ ہم سے رجوع کرتا مگر کیا ہماری بیٹیاں اتنی فالتو ہیں۔''

''چھوٹے چچا! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔'' وہ حیران تھی۔

''کیوں، میں تمہارے بھلے کی ہی سوچ رہا ہوں۔'' وہ برا مان گئے۔

''ہر معاملے میں عورت کو ہی آگے کیوں کیا جاتا ہے۔ جب میرا نکاح ہوا تو کسی نے بھی مجھ سے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب مجھ پہ مہربانی کیوں کی جا رہی ہے۔ آپ میری طرف سے خود ہی سب کچھ کرنے کے مجاز ہیں۔ میری رائے کیوں طلب کی جا رہی ہے۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ بڑے ابا کی جائیداد ملکوں کے قبضے میں چلی جائے۔ آپ نے سوچا ہے بڑی امی اور بابر کا کیا بنے گا؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟''

آج پہلی بار اسریٰ نے ان کے سامنے بولنے کی جرأت کی تھی اور انہیں آئینہ دکھایا۔

''چھوٹے چچا! یہ مناسب نہیں ہے کہ بڑی امی اور بابر بھائی خالی ہاتھ رہ جائیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ میں عدالت تک جاؤں۔ مجھے وہ بے عزتی اور توہین گوارا ہے مگر یہ نہیں جس سے بڑی امی کے دل کو ٹھیس پہنچے۔''

اسریٰ نے انہیں بے طرح شرمندہ کیا تھا۔

زیاد نے پہلی بار ''شاہ ہاؤس'' میں قدم رکھا۔

گیٹ پہ متعین چوکیدار نے اندر اس کی آمد کی اطلاع دی۔ رابعہ خود باہر آئی اور اسے اندر لے گئی۔

ڈرائنگ روم میں اسریٰ پہلے سے موجود تھی۔

زیاد نے سرسری سی نگاہ اس پہ ڈالی اور شائستگی سے احوال پوچھا۔ وہ دھیرے سے سر ہلا کر رہ گئی فضا میں ایک تکلیف دہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زیاد پہلی بار رابعہ سے ملا تھا اور متجسس تھا کہ آخر رابعہ نے اسے کیوں بلایا ہے۔ گاؤں میں جب یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ جلد ہی

جرگہ طلب کیا جائے گا جس میں اسریٰ بھی شامل ہو گی۔ اس کے تناظر میں یہ بلاوا بڑا معنی خیز تھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کیوں بلوایا ہے؟"

"آرام سے۔ ذرا دم تو لے لیں پھر آپ کو بتاؤں گی۔" رابعہ خوشگوار لہجے میں بولی تو زیاد کے خدشات یکلخت مٹ گئے۔

"آپ مجھے زیاد یا بھائی بھی کہہ سکتی ہیں۔ آخر کو ہمارے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔" زیاد نے یہ کہتے ہوئے اچٹتی ہوئی نگاہ اسریٰ پر ڈالی جو کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

"ہوں۔" رابعہ نے ہنکارا بھرا اور صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"بات یہ ہے کہ اسریٰ شہر کی پروردہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر نازک احساسات کی مالک ہے۔ یہ جرگوں پنچائتوں کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ سب پسند نہیں ہے۔ محض دشمنی میں جو تعلق صلح کی آڑ میں جوڑا جائے اسریٰ کے نزدیک وہ قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لیے یہ کہنا ہے کہ......"

"بس۔ اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔" زیاد کا چہرہ اس کی اگلی بات کا مطلب جانتے ہی سرخ ہو گیا اور اس نے رابعہ کا جملہ کاٹ دیا۔

اسریٰ اس دوران بالکل لاتعلق بنی رہی۔ اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔

"یہ میری عزت بن چکی ہیں۔ اس سے پہلے ان سے میرا قلبی تعلق تھا مگر اپنی عزت کا تحفظ میرے لیے قلبی تعلق سے بڑھ کر ہے۔ یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ میں محبت تو چھوڑ سکتا ہوں، عزت کو پس پشت نہیں ڈال سکتا۔"

شدت جذب سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

زیاد کچھ کھائے پیے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

❁

حمزہ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر اسریٰ کا ذہن ایک ہی جملے پر اٹکا ہوا تھا۔

"شمائل بالکل تمہاری طرح ہے۔"

حمزہ کے اس ایک جملے پر وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو مجھے حقیقت بتا دینی چاہیے تھی، شاید مجھے اعتبار کھونا نہ ہوتا۔ میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھے تھے مگر..." حمزہ نے اس سے نگاہیں چرالیں۔

ساڑھے چار سال قبل حمزہ کی منگنی شمائل سے ہوئی تھی۔ بے پناہ مخالفتوں اور اعتراضات کا سامنا کرنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا۔ شمائل انگلینڈ میں مقیم تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ حمزہ بھی اس کے ساتھ انگلینڈ چلے اور وہیں اپنی پریکٹس شروع کرے۔ حمزہ جو پور پور اس کی محبت میں سرشار تھے، شمائل کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ شمائل نے ان پہ واضح کر دیا کہ وہ پاکستان میں مستقل نہیں رہ سکتی۔ اگر حمزہ اس سے سچ مچ محبت کرتے ہیں تو اسے انگلینڈ آنا پڑے گا۔ حمزہ کی مردانہ انا آڑے آ گئی۔ تو انہوں نے شمائل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور دھیرے دھیرے دوری کی اس آگ میں سلگتے رہے۔ ان دونوں کے مابین صرف اور صرف انا حائل تھی۔

اسریٰ نے ہاؤس جاب کے لیے جس ہاسپٹل میں اپلائی کیا، وہاں حمزہ پہلے ہی کام کرتے تھے.... اسریٰ کو دیکھ کر وہ چونک سے گئے۔ وہی شمائل کی سی فطرت، اس کے جیسی پسند و ناپسند، چال ڈھال اور بے ساختہ انداز۔

گھر والوں کی طرف سے ان پہ شادی کے سلسلے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بے دردی سے سوچا۔ اگر وہ اسریٰ سے شادی کر کے شمائل کو حیران کر دیں تو کیسا رہے گا۔ اسریٰ کے ابو بھی ان سے مل کر خوش ہوئے مگر رشتہ طے کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

شہباز گیلانی نے ہاشم کی موت کے بعد انہیں گھر آنے سے روک دیا اور اسریٰ سے دور رہنے کو کہا۔ طبعاً حمزہ بزدل سے انسان تھے اور ویسے بھی کون سا انہیں اسریٰ سے طوفانی محبت تھی، اس میں محض شمائل کی جھلک ہی تو تھی۔ وہ شمائل تو نہیں تھی۔ رہی سہی کسر شمائل کے انگلینڈ میں ہونے والے ایکسیڈنٹ نے پوری کر دی۔

اپنی ساری انا بالائے طاق رکھ کر شمائل کے پاس انگلینڈ پہنچ گئے۔

اب وہ اسریٰ کے سامنے معذرت پیش کر رہے تھے۔

"شمائل اسی ہفتے آ رہی ہے، ہماری شادی کی تقریب عنقریب ہوگی۔ مجھے مبارکباد نہیں دو گی۔"

"کس سلسلے میں؟"

"میرا زیاد ملک کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے اس سلسلے میں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" حمزہ نے حیرت کے اچانک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"رخصتی کب کروا رہی ہو؟"

"اسی ہفتے اور شامل کرنا مت بھولیے گا اور ہاں، اس ملال کو دل میں جگہ مت دیجیے گا کہ آپ نے میرا دل توڑا ہے بلکہ مجھے شرمندہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب آپ والدہ کے ساتھ ہمارے گھر آئے تھے تو مجھے سب کچھ اچھا نہیں لگا کیونکہ آپ سے پہلے ہی زیاد مجھے پسند کر چکے تھے۔ آپ کو وہ مریض یاد ہے جو مجھے بہت تنگ کرتا تھا، وہی شوہر کی حیثیت سے میری زندگی میں شامل ہوئے ہیں۔"

مردوں، مریضوں میں فرق ہوتا ہے۔

حمزہ نے اپنی گفتگو کا بالکل بھی لحاظ نہیں کیا تھا اور زیاد کے نزدیک نکاح کے بعد اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی۔ اس روز جب غصے کے عالم میں زیاد وہاں سے نکلا تھا تو رابعہ آپی نے اس سے کہا تھا۔

"زیاد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ اس کا دل مت توڑو۔" اور امرتی نے..... اس کی بات سمجھ لی تھی۔

چار روز پہلے وہ حویلی رخصت ہو کر آئی تھی۔ سب نے اس محبت بھرے ماحول میں دل سے اس کا استقبال کیا تو وہ اپنے غلط اندازوں پہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

❀

رابعہ سے مل کر ابھی ابھی گئی تھی۔ امرتی اداس سی تھی۔ اماں جان اسے اندر لے آئیں۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ ایک دو ماہ بعد زیاد تمہیں رابعہ بیٹی سے ملوا کر لے آئے گا۔ تم خود کو تنہا مت سمجھنا، ہم سب ہیں نا۔ میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔ تمہیں کسی سے کوئی بھی شکوہ یا شکایت ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" اماں جی نے فرطِ محبت سے اسے خود سے چمٹا لیا۔

"نہیں میں اب پریشان نہیں ہوں۔" امرتی بولی تو وہ مسرور سی ہو گئیں۔

زیاد اندر آیا تو وہ چلی گئیں۔

امرتی سر جھکائے زمین کو دیکھنے لگی۔ ہلکے اورنج اور گرین رنگ کے کامدار سوٹ میں

زیورات سے آراستہ وہ روز اول کی طرح دل نشیں لگ رہی تھی۔

"یار! ہماری شادی کو چوتھا روز ہے اور تم ابھی تک پہلے روز کی طرح بلش کر رہی ہو۔" زیاد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

اسریٰ کا چہرہ اس کی نگاہوں کی تپش سے سنسنانے لگا۔

اس نے رخ موڑنا چاہا مگر زیاد نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔

"تم نے اپنی بے رخی سے مجھے بہت جلایا ہے اور اب یوں ڈری سہمی ہو، مجھے ہنسی آ رہی ہے۔"

زیاد کے تیور بدل رہے تھے۔ "وہاں ہاسپٹل میں تو بڑی تھانیدار نظر آتی تھیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟" زیاد نے اس کی نقل اتاری

"ڈاکٹر صاحب! مجھے مستقل طور پہ اپنے مریضوں کی لسٹ میں شامل کر لیں۔" زیاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جو حیا کے بوجھ سے مستقل جھکی ہوئی تھیں۔

"پلیز......آپ اس طرح مجھے مت دیکھیں۔"

زیاد ہنستا چلا گیا۔

"تو پھر کیسے دیکھوں، اب انہی شوہرانہ نگاہوں سے عمر بھر دیکھوں گا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو اسریٰ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

زیاد کی آنکھیں جذبوں کی لو سے دہک رہی تھیں۔

"ذرا دعوتوں سے فارغ ہولیں تو ہاسپٹل والا معاملہ دیکھوں گا۔ اگر تم گاؤں والے ہاسپٹل میں کام کرنا چاہتی ہو تو میں سمجھوں گا کہ گاؤں والوں کی خوش قسمتی ہوگی کیونکہ یہاں کوئی ڈاکٹر بھی زیادہ عرصہ نہیں ٹکتا۔

"میں یہیں کام کروں گی۔" اسریٰ بولی تو زیاد کا چہرہ کھل اٹھا۔

"تم نے میرے دل کی بات کیسی سن لی۔" وہ پھر چڑی سے اتر رہا تھا۔ یہ معمہ بھی حل ہو چکا تھا کہ اسے پھول اور کارڈ بھجوانے والا بھی وہی تھا۔ زیاد اس کی حیران شکل دیکھ کر خاصا محظوظ ہوا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی، رات کا اندھیرا ہر چیز کو گرفت میں لینے کی تیاری کر رہا تھا مگر اسریٰ کے لیے زندگی کی راہیں بڑی روشن اور واضح تھیں۔ زیاد جیسا مضبوط ساتھی اس

کے ہمراہ تھا۔

"چار روز سے میں نے تمہیں ٹھیک طرح سے دیکھا ہی نہیں ہے تم اپنی آپی کی ناز برداریوں میں مصروف تھیں اور میں قریب رات گئے تمہارا انتظار کرتے کرتے سو جاتا۔ کتنی سنگ دل ہو تم اسریٰ۔"

زیاد کے لب پیار بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اسریٰ نے لاکھ دامن بچانا چاہا مگر زیاد کی شوخ نگاہیں کہہ رہی تھی کہ فرار کی کوئی راہ نہیں ہے اور اب وہ فرار چاہتی بھی کب تھی۔

اسریٰ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں اور زیاد کی چاہت کی بارش میں بھیگتی چلی گئی۔